دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ
الحق
ماہنامہ
زیر سرپرستی
شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبد الحق بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور
مغربی پاکستان

لہ دعوۃ الحق

قرآن وسنّت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

مدیر ــــــــــــــ سمیع الحق

اس شمارے میں

جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۴ ــــــ ذی قعدہ ۱۳۸۹ھ ــــــ جنوری ۱۹۷۰ء

بدل اشتراک

مغربی اور مشرقی پاکستان سے سالانہ -/۸ روپے، فی پرچہ ۷۰ پیسے

غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ

ہوائی ڈاک دو پونڈ

سمیع الحق استاد دار العلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج یکم جنوری ہے اور ملک میں سیاسی سرگرمیوں سے وہ تمام پابندیاں ہٹالی گئی ہیں جو مارشل لاء کی نرم روش اور تدبّر آمیز پالیسی کی وجہ سے پہلے ہی برائے نام سی رہ گئی تھیں۔ اب تمام پارٹیوں کو جلسے جلوس اور دیگر پبلک ذرائع سے اپنا سیاسی اور انتخابی پروگرام پیش کرنے کا آزادانہ موقعہ مل سکے گا۔ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ووٹ کا استعمال اور ایک ضابطہ کے اندر ایک نمائیندہ عوامی حکومت کے قیام کیلئے آئینی جدوجہد کا موقعہ عرصہ بعد اسلامیانِ پاکستان کو نصیب ہو رہا ہے جو دلی مسرت کا باعث ہے۔

— اس وقت جبکہ بدقسمتی سے وطنِ عزیز نظریاتی اور فکری انتشار کے ایک چوراہے پر کھڑا ہے، انتخابات کا یہ سنہری موقعہ اپنے جلو میں خطرات کا ایک طوفان بھی لئے ہوئے ہے، ان حالات میں ملک و ملت کی کشتی کو منجدھار سے نکال کر اور تلاطم خیز طوفانوں سے بچا کر سالمیت اور عافیت کے کنارے تک پہنچانا وقت کی ایک نازک ترین ذمہ داری ہے جسے ملک کے تمام اربابِ سیاست، معاملہ فہم قائدین، ذی شعور عوام بالخصوص عظمت اسلام کے علمبردار علماء اور اسلام کے نام لیوا تمام مسلمانوں کو نباہنا ہے، نمائیندہ حکومت کے قیام تک کا یہ عرصہ ان تمام لوگوں کے اخلاص تدبّر، سیاسی شعور اور ملّی و دینی جذبات کیلئے امتحان اور آزمائش کا وقفہ ہے، ایسا وقفہ جو قوموں کی تاریخ میں باربار نہیں آیا کرتا۔ ملک وملت کی بھلائی کا واقعی معنوں میں ہمیں کتنا فکر ہے۔؟ عوام کے بنیادی مسائل ان کے دکھ درد، افلاس، بیماری اور دیگر بنیادی حقوق کا ہمیں کتنا احساس ہے۔؟ اور سب سے بڑھ کر اس ملک میں دین کے اعلاء، اللہ کے احکام و فرامین کی سربلندی اور اجراء کا ہمیں کتنا درد ہے۔؟ اور ہمارے سیاسی اور ملّی بلند بانگ دعوے کس حد تک حقیقت سے ہمکنار ہیں؟ اور اس طرح کی وہ تمام باتیں جو پچھلے بائیس سال سے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن چکی ہیں، اس انتخابی عرصہ میں ان کا واضح اور دوٹوک جواب دنیا کے سامنے رکھنا ہے اور ان سوالات کے جواب پر ہمارے مستقبل کی تعمیر یا تخریب کا دارومدار ہے۔

آج قوم کی اکثریت اس درد سے کراہ رہی ہے کہ اس ملک کے قیام کا بنیادی نظریہ مجروح

ہو رہا ہے، پاکستان کی سالمیت، نظریۂ پاکستان کا تحفظ، اور معاشی عدل و انصاف کے نعرے بلند ہو رہے ہیں، قوم و ملت کی ایک ایک بیماری اور خرابی کرید کرید کر اس کے لئے نسخہ ہائے شفا تجویز ہو رہے ہیں۔ مگر اب یہ عوام کے فہم و تدبر، ماضی کے تجربات کا شعور، ... عاقبت اندیشی اور ملی و سیاسی سوجھ بوجھ پر ہے کہ ان نسخوں میں زہر ہلاہل اور تریاق کی تمیز کریں، مخلص، ایثار پیشہ، خیر اندیش سیاستدانوں اور عیار، منافق، ابن الوقت اور جاہ پسند، طالع آزماؤں میں فرق کر سکیں نعرے تو بائیس سال سے لگ رہے ہیں اور پاکستان سے قبل بھی ہر طرف دلآویز نعروں کا غلغلہ رہا، اور اس ملک میں اسلام، جمہوریت، معاشی مساوات کے حصول کے لئے جتنے نعرے لگائے گئے شاید دنیا کے کسی حصہ میں اس قدر آسمان سر پر اٹھایا گیا ہو۔ مگر مقصد برآری کے بعد ان نعروں کا جتنا خون خود ان نعرہ بازوں کے ہاتھوں یہاں ہوا شاید اس کی نظیر بھی دنیا کے کسی خطہ میں نہ مل سکے۔ سننے والے عوام کے حصہ میں اگر کوئی چیز آئی تو صرف ایک آہِ ندامت یا سکوتِ حسرت و یاس یا پھر وہی غفلت مجرمانہ جسے شیوہ بنا کر ہم نے اگلے نو وارد نعرہ بازوں کیلئے تازہ میدانِ مکر و فریب آراستہ کیا — افسوس اس قوم کی غفلت کیشیوں پر کہ جب اس کے خوابیدہ جذبات جھنجھوڑے گئے تو سالوں کے ظلم و ستم اور مدتوں کے جبر و استبداد کے محلات اس نے ہفتوں اور مہینوں میں پیوند خاک کر دئیے ایک وقتی جوش اور ولولہ جب بیدار ہوا تو آگ اور خون کی ندیاں پاٹ کر اسلام کی خاطر اس قوم نے ایک وسیع سلطنت کھڑی کر دی، مگر جب اس کو آباد اور مستحکم کرنے کا وقت آیا تو اس ولولۂ ایمانی کا ہزارواں حصہ بھی اس کی صحیح اسلامی تعمیر میں خرچ نہ کر سکا۔ ہم پر جوش نعروں کی پذیرائی میں جتنے پر جوش ثابت ہوئے تھے ان نعروں کی نظر فریبیوں میں کھو کر حقیقت اور عمل کے میدان میں اتنے ہی کوتاہ ہمت اور پست حوصلہ بن گئے، ہمارے عہد زوال و اضمحلال کے سیاہ باب کا عنوان یہی ہے کہ جس جوش اور ولولہ سے ہم میدان کارزار میں کودتے ہیں، مقصد سے گریز فرائض سے غفلت اور ذمہ داریوں سے فرار میں اس سے بھی زیادہ تیز گام ہو جاتے ہیں — ماضی کے تلخ تجربات کو یکسر فراموش کر دینا ہمارا شعار اور مستقبل سے آنکھیں بند کر دینا ہماری جبلت بن چکی ہے۔ اور بظاہر (خدانخواستہ) اب اپنی تاریخ کا ایک اور سیاہ ورق اس نئے انتخابی عرصہ میں لکھنا چاہتے ہیں۔

اس وقت ہمیں جس صورتحال کا سامنا ہے بحمد اللہ اسلامی فکر و نظر سے سوچنے اور سنجیدہ دل و دماغ رکھنے والی اکثریت کیلئے اس سے نمٹنا مشکل نہیں، نہ فلاح اور کامیابی کا راستہ سیاسی گورکھ دھندوں میں

اوجھل ہو سکتا ہے، چند باتیں بالکل واضح ہیں کہ ہم سوشلزم کو کفر و الحاد کی سیڑھی اور کمیونزم کو دین اور ایمان کا قطعی نقیض سمجھتے ہیں، اس لحاظ سے ہم اسے پورے عالم اسلام کیلئے ایک مہلک خطرہ سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی قسم کے سودے بازی، نرمی، رواداری یا سیاسی جوڑ توڑ کے روادار نہیں ہیں۔ بلکہ ہم اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اسی طرح مغرب کا ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام ہمارے تمام معاشی، اخلاقی اور قومی و ملی بربادیوں کی جڑ ہے اس لئے اس پر ہزار بار لعنت بھیجنا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے، ہمارا عقیدہ ہے کہ اس لادینی نظام کی پشت پناہ مغربی سامراج کے ہاتھوں گلشن محمدی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ اس نظام کے سب سے بڑے سرغنہ "امریکہ" کے ہاتھوں ہماری ارضِ مقدس فلسطین کی آبرو لٹ رہی ہے، مسجدِ اقصیٰ کے در و بام سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ فاروقِ اعظمؓ کی مسجد یہود کے نجس قدموں سے پامال ہو رہی ہے، پوری عرب دنیا مصائب اور آلام کی لپیٹ میں ہے، مگر یہ ذلیل سامراج "امریکہ" طیارہ شکن میزائل، فینٹم اور اسکائی ہاک طیاروں سے اسرائیل کی سرپرستی کر رہا ہے، حال ہی میں اسرائیلی وزیر اعظم گولڈا میئر کی پذیرائی کرتے ہوئے صدر نکسن نے ایک ارب ڈالر کا قرضہ دینے کا مزید فیصلہ کیا ہے، جبکہ اسرائیل گذشتہ بیس سال کے دوران بیس ارب ڈالر کے قرضے امریکہ سے وصول کر چکا ہے۔ یہاں تک کہ عرب ممالک کے خلاف اسرائیلی فوج کے نقاب میں لڑنے والوں کی اکثریت امریکی باشندوں کی ہے جسکی تصدیق یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل نے بھی ۲۴ ستمبر کی رپورٹ میں کر دی ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر ہم مغربی سامراج کے ایک ایک نشان کو مٹانا جزوِ ایمان سمجھتے ہیں ـــــ یہ ملک چونکہ خالص اسلام کے نعرے پر بنایا گیا ہے اس کیلئے دس لاکھ سے زائد معصوم جانیں تہ تیغ ہو گئی ہیں۔ کروڑوں افراد بے گھر ہو گئے ہیں اور کروڑوں اب بھی برہمن سامراج کی تلوار کی زد میں ہیں۔ اس لئے اسلام کے خلاف ہر وہ نعرہ جو ملک کے طبقاتی یا نظریاتی تقسیم اور علاقائی، لسانی یا جغرافیائی شیرازہ منتشر کرنے کا ذریعہ بنے ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے۔

جو لوگ اس نعرہ سے منہ موڑ کر قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال جیسے اشخاص کی آڑ میں سوشلزم یا مغرب کے کسی اور لادینی نظام کیلئے راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں تو یہ نہ صرف ان کے روح اور مشن سے بلکہ اُن تمام مسلمانوں کی جانوں اور ان کی عصمتوں سے غداری کر رہے ہیں جنہوں نے اپنے خون سے اس گلشنِ اسلام کو سینچا تھا۔ اگر قیامِ پاکستان کی دعوت دینے والے اس قسم کے لادینی نعروں کو لیکر اٹھے ہوتے تو مسلمانوں کا کوئی ایک فرد بھی ان کا ساتھ نہ دیتا اس لئے کہ اکھنڈ بھارت کی شکل میں

ایسے لادینی خواب بڑی آسانی سے شرمندۂ تعبیر ہو سکتے تھے ——— پھر اگر خدانخواستہ یہ ثابت بھی ہو جائے کہ قائداعظمؒ اور اقبالؒ جیسے لوگ اسلام کا نعرہ محض سیاست اور ڈپلومیسی کی خاطر لگاتے تھے، اور ان کا واقعی مقصد اس ملک میں سوشلزم یا کسی مغربی نظامِ حکومت کا قیام تھا، تب بھی کوئی مسلمان اپنے ان مرحوم قائدین کے کسی لادینی نظریہ کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکے گا، ایسی صورت میں وہ کروڑوں مسلمانوں کے جذبۂ اخلاص اور دین کی خاطر دی گئی قربانیوں کے مقابلہ میں کسی بڑی سی بڑی شخصیت کے لادینی نظریات کو ہزار بار ٹھکرا دیں گے کہ مسلمان قوم کے نزدیک اصل مقام کتاب و سنت کا ہے۔ کسی کے شخصی نظریات کا نہیں، اصل معیار اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے، اشخاص اور اعاظم رجال نہیں جو لوگ اس بحث میں بار بار قائداعظم اور علامہ اقبال جیسے لوگوں کو گھسیٹنا چاہتے ہیں، وہ درحقیقت ان کے بدخواہ ہیں، اور درحقیقت وہ قوم کے دلوں میں ان کی عظمت اور عقیدت ختم کرنے کے درپے ہیں، انہیں اسلام اور اسلامی اقدار سے نفرت ہے مگر منافقت کی وجہ سے اپنے عزائم کا شکار بڑے لوگوں کی آڑ میں کھیلنا چاہتے ہیں، نظریۂ پاکستان کا مطلب ان کے نزدیک ملاؤں کی حکومت ہے اور "ملایانہ نظام" میں انہیں اپنی عیاشیوں اور ستم کاریوں کی موت دکھائی دیتی ہے۔

اس وقت ملک کے تمام مسلمانوں، تمام اربابِ سیاست بالخصوص علمائے کرام و مشائخ عظام سے صرف ایک ہی گذارش کرنی ہے کہ اگر واقعی ہمیں اسلام عزیز اور اسلام کا عادلانہ نظامِ حکومت اور پاکیزہ نظامِ معاشرت محبوب ہے اور آپ انسان کی اخلاقی معاشرتی بدحالی اور معاشی حقوق کی پامالی مزید برداشت نہیں کر سکتے اور آپ اس ملک میں خلافتِ راشدہ کے نہج پر ایک مثالی حکومت دیکھنا چاہتے ہیں جس میں نہ جبر و استحصال ہو نہ ظالمانہ تسلط اور استیلاء اور نہ رعایا کی حق تلفی ہو، نہ حیوانی خواہشات اور بے دینی کا دور دورہ، تو اس اعلیٰ و ارفع مقصد کیلئے یکم جنوری سے ۵ / اکتوبر کی ایک ایک گھڑی اور ایک ایک لمحہ کو اپنے علم و دانش اور فہم و شعور کیلئے ایک آزمائش اور چیلنج سمجھیں، مریض جاں بلب ہے، گذرنے والی ہر گھڑی یا تو اسے موت سے ہمکنار کر دے گی یا پھر اسے نئی زندگی مل جائے گی۔ اب ہمیں اپنی رائے اور اپنا ووٹ استعمال کرتے وقت دیکھنا ہوگا کہ ہمارا پسندیدہ امیدوار قول و عمل اور کردار و اخلاق کے کس معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس کے منشور اس کے نعروں اور اسکی عملی زندگی میں کتنا توافق ہے، وہ اسلام اور ملک و ملت کے درد سے کتنا سرشار ہے۔؟

ہمارے قابلِ قدر علماء کرام کے مختلف گروہوں کو بھی سوچنا ہے کہ وہ اپنے علم و حکمت اور نازک ترین مقام اور منصب کو کس قسم کی سیاست کے بھینٹ چڑھا رہے ہیں، یہاں اسلام پسندی اور غریب پروری کے لبادہ میں بہت سے لیڈر، علماء کے مقام اور مرتبہ سے فائدہ اٹھا کر سیاسی بلیک میلنگ کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور ملک کی تاریخ میں علماء ہی ایک ایسا مظلوم یا سادہ لوح طبقہ ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کی سربلندی کے جذبہ میں عیار سیاستدانوں کے ہاتھ کا کھلونا بنا رہتا ہے، مگر ان لوگوں کو جب بھی علماء کرام کے علم و فکر کے سہارے ایوانِ اقتدار تک پہنچنے کا موقع ملا تو اس وقت علماء کو منبر و محراب سنبھالنے اور نماز و روزہ تک اپنے دائرہ کار کو محدود رکھنے کی نصیحتیں کرنے لگے، ان علماء کے سہارے سیاست اور قیادت کے ایوان تعمیر کئے گئے، مگر جب مقصد حاصل ہوا تو اس "رجعت پسند ٹولے" اور "ملاؤں کی جماعت" کو اسلام اور خدا کا نام لینے کے جرم میں پابندِ قید و سلاسل کیا گیا قیام پاکستان سے لیکر اب تک کونسی پھبتی ہے جو علماء حق پر نہیں کسی گئی اور کون سا مذاق ہے جو اسلام کے ساتھ نہیں کیا گیا، اور یہاں ایسا کرنے والے نہرو اور پٹیل نہیں تھے بلکہ اس جرم میں ضرورت کے وقت اسلام اور نظریۂ پاکستان کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھانے والے پیش پیش تھے۔ ہمارے علماء کو ان نازک ترین لمحات میں اپنی دینی بصیرت سے فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ان کی سیاست خالص اللہ کی رضامندی اور اس کے دین کے لئے مفید ثابت ہو رہی ہے، یا وہ ایک بار پھر نادانستہ طور پر محض چند طالع آزما، نقاب پوش سیاستدانوں اور پیٹ یا اسلام کے نعرہ لگانے والے دائیں اور بائیں بازو کے ایجنٹوں کا آلہ کار بن رہے ہیں۔ علماء کی تمام جماعتوں کو یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اگر کسی سیاسی پارٹی اور جماعت سے تعاون میں دین کے غلبہ اور حاکمیت کا پہلو بھاری ہے، اور ان سے معاہدہ یا سمجھوتہ کرنے میں اسلام کے اجراء کا غالب امکان ہے تو بصد خلوص اس سیاست کا خیر مقدم کرنا چاہیئے، اور اگر اس سیاست بازی کا فائدہ صرف چند عیار اور ابن الوقت پارٹیوں اور اس کے لیڈروں کو پہنچتا ہے، اور علماء کی حیثیت بالآخر اسی حدِ اوسط کی ہے جسے اب تک لیلائے اقتدار سے ہمکنار ہونے کے بعد راندۂ درگاہ چیز سمجھ کر بیچ سے ہٹا دیا جاتا رہا، تو اس ساری ہنگامہ آرائی اور جد و جہد کا نتیجہ چند وقتی منافع اور اغراض کی تکمیل تو ہو سکتا ہے مگر دینِ اسلام، اور پورے طبقۂ علماء کی عزت و وقار اور فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لحاظ سے صفر ہی رہیگا۔ دین اور سیاست الگ الگ چیز نہیں مگر موجودہ دور کی سیاست اور دین کی پیوندکاری بڑے دل گردے کا کام ہے۔ سیاست میں اتنا محو نہیں ہونا چاہیئے کہ دینی مزاج اور اسلامی روح ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے، صحیح سیاست انبیاء کا منصب تھا، مگر وہ سیاست آج کے جوڑ توڑ، مکر و فریب اور دغابازی کی

سیاست نہیں تھی، علماء کا مقام وراثت نبوت کا ہے، وہ اس دور کے پرفریب سیاستدانوں کے جانشین اور نقال نہیں ہیں، وہ سیاست عمر فاروقؓ اور صدیق اکبرؓ کے وارث ہیں، نہ کہ نکولائی میکیاولی کی فریب کارانہ سیاست کے امین۔ حق تعالیٰ اس نازک امتحان میں ہم سب کو جادۂ حق پر قائم رہنے اور حق و باطل کی تمیز کرنے اور ہر حالت میں سیاست کے "سندان عشق" کے ساتھ "جام شریعت" نباہنے کی توفیق دے۔

سہارنپور کے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ بقیۃ السلف بزرگ ہیں، علم و فضل ریاضت و عبادت، رشد و اصلاح، تصنیف و تدریس غرض ہر میدان میں آپ اکابر دیوبند کا کامل نمونہ ہیں پچھلے سال آپ حرمین الشریفین تشریف لے گئے تھے اور اب واپسی پر سرزمین پاکستان کو رونق بخشی ہے، آپ کا وجود باجود تمام مسلمانوں بالخصوص بھارت کے مسلمانوں کے لئے ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ ہم حضرت شیخ کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنا دیدہ و دل ان کے لئے فرش راہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ تادیر با این ہمہ فیض قائم رکھے۔

اسرائیل کی تحقیقاتی عدالت نے مسجد اقصیٰ کو آگ لگانے والے مجرم کو "پاگل" قرار دیکر بری کر دیا۔ اسرائیلی عدالت ایسے رسوائے زمانہ فیصلوں کی عادی ہے۔ اب اس نے ملزم روہان کو پاگل نہیں کہا بلکہ حق و انصاف کی علمبردار پوری دنیا کے عقل و دانش کا مذاق اڑایا ہے مگر جس ظالم، سفاک اور بے حیا عدالت کی اسٹیج پر حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کو سولی چڑھانے کا فیصلہ ہو چکا ہو وہاں اگر پوری اسلامی اور مذہبی دنیا کو ایسے شدید بھونچال سے دوچار کرنے والے مجرم کو پاگل کی بجائے پوری قوم کا ہیرو بھی قرار دیدیا جاتا تب بھی تعجب اور حیرت کی بات نہ ہوتی مگر اس ڈرامہ کو سٹیج کرنے والے ججوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ قدرت قیامت تک اس عدالت کی کرسی پر کبھی بخت نصر اور کبھی ہٹلر جیسے ججوں کو بٹھانے کا اعلان بھی کر چکی ہے۔ واذ تاذن ربک لیبعثن علیھم الی یوم القیامۃ من یسومھم سوء العذاب۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

سمیع الحق

یکم جنوری سنہ ۱۹۷۰ء

ضبط وترتیب : ادارہ الحق

آزمائش اور امتحان کا وقت

یہ تقریر یکم شوال ۱۳۸۹ھ کو نماز عید الفطر سے قبل عیدگاہ میں ہوئی جس میں تقریباً آٹھ ہزار افراد شریک تھے۔

★

(خطبۂ مسنونہ کے بعد) وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم

محترم بزرگو! وقت بہت کم ہے، اور ہمارے فوجی بھائی بھی بہت زیادہ تعداد میں آئے ہیں جن کی خواہش ہے کہ تقریر اردو میں ہو اور پٹھان بھائیوں کی خواہش پشتو کی ہے کوشش کروں گا کہ کچھ نہ کچھ دونوں زبانوں میں عرض کرسکوں کسی خاص موضوع پر کچھ کہنے کا تو موقع بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ ہم سب کو اپنے دربار میں جبین نیاز جھکانے اور سجدہ میں سر رکھ کر اپنے گناہوں پر گڑگڑانے اور معافی مانگنے کا موقع عطا فرمایا ۔

این سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہت سے لوگ آج کے دن بھی اس سعادت سے محروم رہیں گے اور خدا کی توفیق ان کی شاملِ حال نہ ہوگی — ابولہب جن کا نام ہے شعلوں والا چہرہ ان کا دمکتا تھا، حضورؐ سے رشتہ گھر کے قریب، مگر قسمت میں اسلام نہیں، اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس پر ہلاکت کی دعا مذکور ہے تبت یدا ابی لہب وتب ۔ جو آج تک نمازوں اور تلاوت میں دہرائی جاتی ہے، ادھر حضرت بلالؓ حبش کے رہنے والے مسافر ہیں، چہرہ مبارک سیاہ ہے مکہ مکرمہ میں ایک مظلوم غلام ہیں جن پر مصیبتوں کے پہاڑ ڈھائے گئے، گرم ریت پر لٹایا جاتا، رات بھر سونے نہ دیا جاتا، سر پر امیہ کے خادم جوتے اور کوڑے برساتے کہ نیند نہ کرسکیں مگر اس اللہ کے بندے کے قدموں میں لغزش نہ آتی ۔ اسلام کے ان جانبازوں نے ایسی جانبازی دکھائی جس کی برکت سے اسلام کی جڑیں لوگوں کے قلوب میں اور انسانی بستیوں میں قیامت تک گاڑدیں اور آج چودہ سو برس بعد بھی ہم سب

لا الٰہ الا اللہ پڑھتے ہیں۔ تو جس کے گھر سے نعمت کے خزانے تقسیم ہوتے ہیں اس کی قسمت میں نہ تھا تو وہ محروم رہے۔ اور بلال حبشی اور صہیب رومی نے دامن بھر لیا اور وہ مقام پایا کہ حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ راشد نے حضرت بلال کو سردار کے لقب سے نوازا اور حضرت صہیبؓ نے حضرت عمرؓ کا جنازہ پڑھایا اور حضرت بلال کو حضور اقدسؐ نے فرمایا کہ اے بلال تم کونسا ایسا عمل کرتے ہو کہ آج رات میں جنت میں آپ کے قدموں کی آہٹ سن رہا تھا ـــ تو اللہ نے ہمارے اوپر بہت بڑا احسان کیا کہ ہمیں نیست سے ہست کر دیا، خون کے لوتھڑے سے اشرف المخلوقات بنایا اور بہترین شکل دی، اس کی نعمتوں کو ہم شمار بھی نہیں کر سکتے، وہ ازل سے لیکر ابد تک ہمارا محسن ہمارا پالنے والا اور تربیت فرمانے والا ہے اگر ہم اس کے سامنے نہ گڑگڑائیں، اپنی تمنائیں نہ پیش کریں، ہاتھ نہ پھیلائیں تو کس کے سامنے پھیلائیں اس کا ارشاد ہے: یعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم۔

اے میرے بندو جو اپنے اوپر ظلم اور زیادتی کر چکے ہو میری رحمت سے مایوس مت بنو میں سب گناہ بخشنے والا مہربان رب ہوں ـــ تمہارا تو کوئی خالق اور مربی میرے سوا نہیں، میں ہی تمہیں بنانے والا رزق دینے والا اور سلطنت دینے والا ہوں۔

تو بھائیو! اگر ایسے مربی اور رب العالمین کے سامنے ہم نہ گڑگڑائیں تو کس کے سامنے روئیں۔؟ کیا ہمارا کوئی اور کارساز ہے۔؟ ہرگز نہیں۔ ایک آدمی رات بھر اللہ کے سامنے روتا رہا ہاتف غیبی سے آواز آئی۔ "جا مردود تیری کوئی عبادت قبول نہیں ہوئی" دوسری رات پہلی رات سے بھی زیادہ روتا رہا اور عبادت میں مشغول رہا، کسی نے کہا تم مردود ہو گئے ہو اب اتنی عبادت سے کیا فائدہ۔؟ کہا ٹھیک ہے مگر کیا کروں کہیں دوسرا کوئی در بھی ہے۔؟ کہ اللہ کو چھوڑ کر وہاں چلا جاؤں۔" تو کوئی اللہ کی خدائی سے نکل کر کہاں جا سکتا ہے۔؟ ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السموات والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطان۔ تو کیا کوئی اور خالق نعوذ باللہ تمہارا ہے کہ اللہ سے نہ مانگیں اور اس دوسرے سے مانگ لیں۔؟ اللہ کی مہربانی اور شفقت و کرم تو اس قدر ہے کہ مغفرت را بہانہ می طلبد ـــ بہانہ چاہتا ہے، قیمت نہیں مانگتا، ورنہ کون تھا ہم میں سے جو قیمت ادا کر سکتا۔؟

حضورؐ کی امت، دعوت میں آپ کو سب سے زیادہ چاہنے اور سب سے بڑھ کر آپؐ کے خدمتگار ابو طالب تھے، لیکن حضور اقدس ان کی نزع کے وقت انہیں فرماتے ہیں کہ اے عم

بزرگوار میرے کان میں آہستہ سے کلمۂ شہادت کہہ دینا تاکہ آپ کی شفاعت کر سکوں۔ اور اللہ کے قانون نجات کیلئے کم ازکم کوئی سہارا تو مجھے مل جائے کیونکہ وہاں اعلان ہے کہ: ان اللّٰہ لا یغفر ان یشرک بہ۔ شرک کو معاف نہیں فرماتے اس کے علاوہ ہر قسم کے گناہ اگر چاہے تو بخش دیتا۔ تو میرے بھائیو! اللہ کو کیا پڑی ہے کہ اپنے بندوں کو عذاب میں مبتلا کریں۔ مگر کچھ تو بہانہ چاہئے آپ لوگ آج یہاں جمع ہوئے ہیں تو دس پندرہ منٹ عیدگاہ میں بیٹھ کر اس کے سامنے گڑگڑائیں اپنے گناہوں سے توبہ کرلیں۔ اگر ہم اس سے نہ مانگیں تو ہماری حاجتوں کو کون پورا کرے گا۔

بھائیو! میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ یہ عید ہم اس خوشی میں منا رہے ہیں کہ اللہ نے ہمیں رمضان کا مہینہ روزہ رکھنے کی توفیق دی۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی رہنمائی اور ہدایت کیلئے رحمۃ للعالمینؐ کے واسطے سے جو کامل مکمل کتاب قرآن مجید نازل فرمائی، وہ اسی مہینہ میں اتاری گئی۔ یہ نزول قرآن کا مہینہ ہے اور جن لوگوں نے اسی کتاب پہ ایمان کی سعادت پائی اور جن لوگوں نے کتاب اللہ کو واقعی صراط مستقیم جان کر اپنی زندگی کو اسی کے مطابق ڈھال لیا۔ اس کے اوامر و نواہی کی پابندی کی، اس کی ہدایات سے اپنی زندگی سنواری، وہ دین اور دنیا ہر لحاظ سے رشد و صلاح پا گئے، کامیاب ہوگئے۔ اور آج خدا کی قسم ساری دنیا اور ساری قومیں ابوبکر صدیقؓ کا نمونہ نہیں پیش کر سکتیں، حضرت فاروقؓ، عثمانؓ اور علیؓ، خالد بن ولیدؓ اور حضرت معاویہؓ جیسے قرآن سے مالا مال اور سچے عامل نہیں مل سکتے، ان کی کایا قرآن نے پلٹ دی۔ بھائیو! عرب کے رہنے والے ریگستان کے بدّو دنیا بھر کے مالک بنے اور دین کے لحاظ سے یہ حالت کہ زندگی میں حضور اقدسؐ نے جنّت کا مژدہ سنایا۔ ابوبکر فی الجنۃ، عمر فی الجنۃ، عثمان فی الجنۃ، علی فی الجنۃ۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ جنّتی ہیں۔ حضور ایک دن مسجد تشریف لائے، ایک ہاتھ میں ابوبکرؓ کا ہاتھ دوسرے میں حضرت عمرؓ کا ہاتھ تھا، فرمایا جنّت میں ہماری ایسی ہی رفاقت اور معیت ہوگی اور اتنی اچھی حالت جب دین کی طاقت سے ہوتی تو دنیا کیوں ان کے قدموں میں نہ ہوتی، دنیاوی جاہ و جلال بھی ان کا ایسا تھا کہ قیصر و کسریٰ اپنے محلّات میں لرز جاتے۔ اس لئے کہ جہاں دین ہوگا وہاں دنیا ضرور ہوگی کہ خادم اپنے مخدوم کے ساتھ رہتا ہے۔ تو اللہ نے ان کے ہاتھ میں تاج و تخت بھی دیا، اس لئے کہ انہوں نے اپنی زندگی قرآن کے سپرد کی۔ آج اللہ تعالیٰ ہمیں بھی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ: ولا تکونوا کالذین نسوا اللّٰہ فانساھم انفسھم۔ اے میرے بندو! اور اے رسول اللہ کے امتیو تم ان لوگوں جیسا مت بنو جنہوں نے اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دیا، اسے بھول گئے تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے بھی بھلا دیا وہ اپنی حقیقت اور ذات کو بھی بھول گئے، انہیں باپ

بیوی، دکان، زمین، ملازمت تو سب کچھ یاد ہے مگر اللہ کو بھولے ہوئے ہیں، قرآن کو اپنے خالق اور مربی کو اپنے محسن کو فراموش کر بیٹھے تو اللہ نے فرمایا کہ اے لوگو! تم ایسے مت بننا کہ کافر قوموں ہندو سکھ یہود اور عیسائیوں کی تقلید میں اپنے آپ سے غافل ہو جاؤ ورنہ اپنی حقیقت بالکل بھول جاؤ گے اور جب آدمی کی عقل ماری جائے تو نفع نقصان کی چیزوں کو بھی نہیں سمجھتا۔

محترم بزرگو! حضورؐ نے ہماری رہنمائی فرمائی، ہمیں دین، عقائد، عبادات معاملات اور اخلاق سکھائے۔ ان کا طریقہ سکھلایا، اور آج الحمد للہ کہ عبادات کے سلسلہ میں تو مسلمان کچھ نہ کچھ کرتا ہے۔ مگر معاملات، معاشرت اور اخلاق کے معاملہ میں ہم اسلام سے بہت دور ہو گئے اور یہ بہت بڑی بربادی اور تباہی کی علامت ہے، اور یہی ہماری پسماندگی کی وجہ ہے کہ ہم معاملات اور معاشرت میں اوروں کی طرف دیکھتے ہیں، حضورؐ کی طرف ہماری نگاہیں نہیں اٹھتیں۔ یاد رکھئے ہمارے دین کا تعلق صرف عبادات سے نہیں، وہ معاملات، معاشیات، اخلاق و معاشرت سب پر حاوی ہے۔ اگر ہم نے اپنی زندگی میں دین اور دنیا کا تقسیم کرادیا۔ تو ہم مسلمان نہیں رہ سکیں گے۔ اور پھر ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو کھڑا کر دے گا جو تم سے بہتر اور پوری مومن اور مسلم ہوگی۔ اگر اسلام اور اس کے دیئے ہوئے نظام کو قائم اور بلند رکھنے میں ہم سے ذرا بھی غفلت ہو گئی اور ہم نے پیٹھ پھیر دی، تو کسی فاسق سے بھی اللہ اپنے دین کا کام لے لیگا، مگر ہم محروم رہ جائیں گے۔ اور اگر ہم نے اپنی زندگی اسلام کے سپرد کی تو اللہ کی مدد بھی شامل حال ہو جائے گی، ان تنصروا اللہ ینصرکم (اگر تم نے اللہ کے دین کی مدد کی تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔)

حضرت عمرؓ کی زندگی آپ دیکھیں، اللہ نے ان کو کیسی فتوحات عطا فرمائیں، کہاں وہ مدینہ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور کہاں مصر کہ دریائے نیل کے نام ایک خط لکھتے ہیں کہ اے نیل اگر تو اللہ کے حکم سے بہتا ہے تو بہتا رہ۔ اور اگر اپنی مرضی سے بہتا ہے تو ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ وہ رقعہ خشک دریا میں ڈال دیا گیا، اور اس وقت جو چلا تو آج تک نہیں رکا۔ ہم دعائیں کرتے ہیں تو آیا ہوا بادل چلا جاتا ہے۔ علاء حضرمی سخت دھوپ اور بے آب و گیاہ جنگل میں پھنس گئے، فوج بھی ساتھ ہے جتنے اونٹ اور گھوڑے ہیں سب پیاس کے مارے بھاگ گئے، فوجی بھی پیاس سے مر رہے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں اور کیا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نہیں نکلے۔؟ سب نے نماز پڑھی اور دعا کی کہ اے اللہ ہمیں پانی دینا۔ اسی وقت زمین سے چشمہ ابلتا ہے، ٹھنڈا پانی نکلا اور سب سبحان اللہ پکار اٹھے، یہ ہے وہ نصرت جس کا وعدہ اللہ نے

فرمایا ہے آج ہم سب کشمیر اور فلسطین جیسی ریاستوں میں مقابلہ نہیں کر سکتے مگر علا حضرمی ہمارا ایک فوجی جرنل تھے، سمندر کے کنارے پہنچے، فوج بھی ساتھ ہے جو کشتیوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ نے دیکھ کر کہا کیوں انتظار کرتے ہو، بحیرہ قلزم کا کنارہ ہے، سمندر میں کود پڑے، ہاتھ اٹھایا اور دعا کی کہ اے اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے تو نے بحیرۂ قلزم میں بارہ سڑکیں پیدا کیں، آج حضورؐ کے صحابہؓ کیلئے بھی راستہ پیدا فرما۔ چنانچہ سب ساتھیوں سمیت سمندر کو اطمینان سے عبور کیا، تو آج اگر ہم مسلمان بن جائیں تو اللہ کی رحمتیں یقیناً ہمارے ساتھ ہوں گی۔

ہمارا یہ ملک اللہ کے فضل سے آزاد ہوا، اس وقت خدا کی رحمتیں ہمارے اوپر تھیں کہ خدا نے بے سروسامانی میں ہمیں محفوظ رکھا، ۱۹۶۵ء میں ان نہتے مسلمانوں اور مخلص مجاہدین کی قربانیوں سے اللہ نے ہماری حفاظت کی اسی ملک کو ہم نے جس مقصد کے لئے حاصل کیا تھا وہ ہمارا نظریہ تھا کہ ہم خالص اسلامی حکومت بنانا چاہتے ہیں ہمارے ہاں ایسا معاشرہ ہوگا کہ زنا چوری سود، جوا نہ ہوگا۔ ہمارے ہاں کوئی بھوکا اور ننگا نہ ہوگا۔ ہمارے سامنے حضرت عمرؓ کی مثالیں تھیں جو رات بھر گھومتے کہ کسی کو تکلیف تو نہیں کہیں معلوم ہوا کہ ایک بچہ رات کو رو رہا ہے، معلوم ہوا کہ ابھی اس کو حکومت سے وظیفہ مقرر نہیں ہوا چونکہ دودھ سے چھوٹنے پر وظیفہ مقرر ہوتا تھا اس لئے ماں نے قبل از وقت دودھ چھڑا دیا کہ وظیفہ مقرر ہو جائے۔

حضرت عمرؓ کو بڑا افسوس ہوا اور حکم دیا کہ بچہ کے پیدا ہوتے ہی اُسے وظیفہ دیا جائے حضرت عمرؓ فرمایا کرتے کہ اگر اللہ نے مجھے زندگی دی تو عراق کے دور دراز علاقہ میں کوئی بیوہ اور مسکین بھوکا نہیں رہے گا، حضرت عمرؓ فرماتے کہ اگر عراق میں فرات کے کنارے بھی اگر کوئی کتا بھوک کی وجہ سے مر گیا تو اللہ تعالیٰ مجھ سے احتساب کرے گا تو اگر امیرالمؤمنین کو محاسبہ کا اتنا فکر ہو تو ساری رعایا پر اس کا اثر کیوں نہ پڑتا، یہاں تو یہ حالت ہے کہ پچھلے دنوں مختلف محکموں کے ۳۰۲ افسر و افسروں کو بدعنوانی کی سزا میں معطل کیا گیا، جو فہرست شائع ہوئی ہے اس میں بڑے بڑے ستارے اور بڑے تمغوں والے بھی ہیں، جو ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے۔ تو بقول شاعر جب امیر انڈے کی چوری میں عار نہ سمجھے تو رعایا اور ماتحت افسر مرغ کباب سیخ پر کیوں نہ چڑھائیں گے، اس سارے عرصہ میں جو بھی آیا خود کمایا اور سارا خود کھانے کی فکر کرنے لگا۔ مگر اللہ کا حکم ہے کہ خود کماؤ اور اوروں کو کھلاؤ ——— اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیکی کی توفیق دے۔ آمین　　　　(نامکمل)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

محقق اسلام علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم

مذہبی سوالات اور سائنس کی حد پرواز

"کیا سائنس فطرت انسانی کے مطالبات کا جواب دے سکتی ہے۔؟ ہم منتظر ہیں کہ سائنس یہ سب کچھ کر سکے کیونکہ ہمارے بہت سے ایمانی دعووں کی توثیق انہیں انکشافات، اور سائنسی تحقیقات پر موقوف ہے ــــــ"
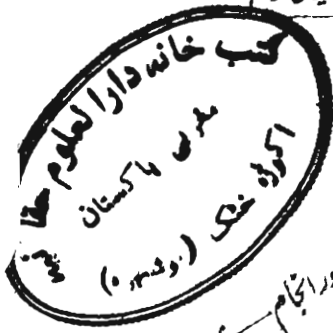
مذہب کے اس بنیادی سوال (عالم کا نقطہ آغاز اور انجام) کو سائنس حل کر سکتی ہے یا نہیں، اس کے لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ سائنس کی حد پرواز کیا ہے، علماء سائنس نے اس علم کے حدود کو معین کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمامتر فطرت کے ان واقعات اور مشاہدات سے ہے جو ہمارے زیر تجربہ آسکیں لیکن جو چیزیں ہمارے احساس اور مشاہدہ کے دائرہ سے خارج ہیں، سائنس کو ان کے اقرار و انکار سے کچھ بحث نہیں۔"

ماہرین سائنس کا اعتراف | پروفیسر لیتر جو فرانس کا مشہور ماہر سائنس ہے، لکھتا ہے:

"کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے اس لئے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں، جسطرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ رہتا ہے۔"

پروفیسر ٹنڈل نے اس خیال کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے:

"اگر تم گھڑی کو دیکھو اس میں گھنٹے منٹ سکنڈ کی سوئیاں نظر آئیں گی، یہ سوئیاں کیوں

پھرتی ہیں اور اُن کی حرکت کی باہمی نسبت جو ہمیں نظر آتی ہے کیونکر قایم ہے، ان سوالات کا جواب بے گھڑی کے کھولے اور اس کے مختلف پرزوں کو اچھی طرح دیکھے اور ان کا دوسروں سے تعلق قایم کئے بغیر نہیں دیا جا سکتا ہے، جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے تو ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ سوئیوں کی یہ خاص حرکت گھڑی کی اندرونی ساخت اور مشین کا نتیجہ ہے جو کوک کی قوت سے چل رہی ہے، سوئیوں کی یہ حرکت صنعت انسانی کا ایک کارنامہ ہے، لیکن بجنسہ یہی حال واقعات وحوادث فطرت کا ہے، عالم کی اس مشین کے اندر بھی ایک مخفی مشین کارفرما ہے اور ایک خزانۂ قوت ہے جو اس مشین کو چلا رہا ہے، سائنس کا انتہائی کام اس مشین اور ذخیرۂ قوت سے پردہ ہٹا کر یہ بتانا ہے کہ واقعات وحوادث ان ہی دونوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ ہیں لیکن کارخانۂ عالم کی یہ اندرونی مشین خود کیا ہے، اور کیسے بنی اور اس گھڑی کو کس نے کوکا اور اس کی چلانے والی قوت کہاں سے آئی، یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب سائنس کے بس سے باہر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس نہ تو قدرتی قوانین کو ایجاد کرتی ہے، نہ ان قوانین کی تمام کڑیوں کو سلجھا کر ہمارے سامنے پیش کر سکتی ہے بلکہ حوادث وواقعات کے محض ان حلقوں کو ترتیب کیساتھ ہمیں بتانے کی کوشش کرتی ہے جو اس کے دائرہ احساس ومشاہدہ میں آجاتے ہیں، مثلاً وہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا نہیں کرتی بلکہ صرف یہ بتاتی ہے کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ جلاتی ہے، وہ اسٹیم کو ایجاد (وجود بخشنا، تخلیق کردن) نہیں کرتی، بلکہ صرف اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ جب آگ کا تعلق پانی سے ہوتا ہے تو یہ ایک قدرتی قانون ہے۔ کہ وہ بھاپ بن جائے، بہرحال ہمارے سامنے جو کچھ قدرتی قوانین پھیلے ہوئے ہیں ہم ان کو بنا نہیں سکتے بلکہ صرف جان سکتے ہیں، اور سائنس اس پر اتنا اور اضافہ کرتی ہے کہ اسی حد تک جان سکتے ہیں جس حد تک مشاہدہ ہمارا ساتھ دے گا، لیکن یہ سوال کہ اُن قوانین کا مقنن کون ہے، ان کا نقطۂ آغاز کیا ہے اور ان کا آخری انجام کیا ہوگا، سائنس کے حدود سے اس کا جواب خارج ہے۔

انسان صرف کچھ جان سکتا ہے، کسی چیز کی تحقیق وایجاد پر وہ قادر نہیں

ہکسلے نے سائنس کی اسی درماندگی کا اندازہ کرنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ:

"وہ کسی چیز کی بھی کامل توجیہہ نہیں کر سکتی اس کے سارے اسباب اوّل سے آخر تک نہیں بتائے جا سکتے کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ بھی توجیہہ میں آغاز اشیاء کی جانب چند

قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

حکیم اور عامی میں فرق | بہرحال انسان کی انتہائی پرواز سائنس کے نقطۂ نظر سے صرف اس قدر ہے کہ کل نہیں بلکہ فطرت کے صرف اُن قوانین کو وہ جان سکتا ہے جو جو اس کی گرفت میں آجائیں، باقی رہا یہ سوال کہ جب صرف محسوس قوانین کی واقفیت تک عام انسانی پرواز ختم ہو جاتی ہے. تو حکیم اور عامی میں کیا فرق رہا۔؟ تو بات یہ ہے کہ گو عامی کا علم بھی مشاہدات اور محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے، اور حکیم بھی اس دائرہ کے آگے قدم نہیں رکھ سکتا، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامی آدمی کسی حادثہ یا مظہر قدرت کو جب دیکھتا ہے تو وہ اس کے اثرات کو دور تک نہیں لے جا سکتا، یعنی ایک جزوی واقعہ سے کلیہ نہیں بنا سکتا اور حکیم ایک جزوی واقعہ کو دیکھ کر چونکتا ہے، اور یہ دیکھنا شروع کرتا ہے کہ آیا یہ واقعہ اسی جزیہ تک محدود ہے یا آگے بھی بڑھ سکتا ہے، پس اگر اس میں کچھ وسعت نظر آتی ہے تو چند جزئیات پر منطبق کرنے کے بعد اسی جزیہ کو وہ کلیہ کی شکل عطا کرتا ہے، اور اسی کو قانون کے نام سے موسوم کرتا ہے، مثلاً نیوٹن نے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا، اس طرح ہر شخص دیکھتا ہے، لیکن وہ چونکا کہ آخر کیوں گرتا ہے اس کو محسوس ہوا کہ زمین کی کشش کا نتیجہ ہے، اب اس کشش کی خاصیت کو اس نے دوسری چیزوں میں ڈھونڈھنا شروع کیا بالآخر اُس نے اعلان کیا کہ فضا میں جتنے کرے تیر رہے ہیں وہ سب جذب و کشش ہی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ بہرحال نیوٹن نے فضائی کروں کی خاصیت کا ایک علم حاصل کیا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ان کروں کا موجد تھا، یا اس نے اُن میں جذب و کشش کی خاصیت پیدا کر دی تھی، جو قانون پہلے سے موجود تھا صرف اس کا علم اس نے حاصل کیا اس سے زیادہ نہ اس نے کچھ کیا اور نہ کر سکتا تھا وہ خود کہتا ہے۔

"عالم فطرت کی یہ نیرنگیاں (جذب و کشش) واجب الوجود کے ارادہ کے سوا اور کسی شئے سے ظاہر نہیں ہو سکتیں وہ واجب الوجود جو ہر جگہ اور ہمیشہ موجود ہے۔"

اور یہی حال سائنس کے تمام مسائل اور اختراعات کا ہے، بھاپ سے کیتلی کے ڈھکنے کو اٹھتے ہوئے سب ہی دیکھتے ہیں جس طرح اسٹیفن نے دیکھا، لیکن اسٹیفن نے اس جزوی مشاہدہ سے ایک کلیہ پیدا کیا اور اس کلیہ کو فطرت کے دوسرے قوانین مثلاً لوہے کی لچک پہیوں کی گردش اسی قسم کے میکانکی قوانین کے علم کے ساتھ وابستہ کر دیا اس نے اپنے کسی پیدا کردہ قانون کو نہیں بلکہ قدرتی قوانین کو اس شکل میں نمایاں کیا ہے جسے ہم ٹرین کہتے ہیں۔

الغرض صنعت و حرفت والے قدرتی قوانین کے جزئیات سے کلیات کا علم حاصل کرتے ہیں

لیکن کسی چیز کی ایجاد (یعنی اس کو وجود بخشنا) ایک غریب انسان کے بس کی بات نہیں وہ نقطہ "علم آدم الاسما کلھا۔ (سکھایا اللہ نے آدم کو سارے اسماء) کے اجمال کی تفصیل کرسکتا ہے اور یہی اسے دیا بھی گیا ہے۔

سائنس اور مذہب کے حدود۔ | الحاصل جب سائنس کا سارا زور مشاہدات اور محسوسات پر ختم ہوجاتا ہے تو خود اندازہ کرو کہ جن سوالات پر مذہب کی بنیاد قائم ہے، مثلاً عالم کا نقطہ آغاز کیا ہے۔؟ جیساکہ کسی نے کہا تھا کہ سائنس کا قدم آغاز اشیاء کی جانب چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، تو پھر آخری نقطہ تک اس کی رسائی کیونکر ہوسکتی ہے۔

پس سچ یہ ہے کہ سائنس جہاں اپنی تحقیقات ختم کردیتی ہے، مذہب وہیں سے اپنا درس شروع کرتا ہے، سائنس صرف عالم شہادت (عالم محسوس) کے چند واقعات محسوسہ کو کلیات کی شکل میں پیش کرکے اپنے بازو ڈال دیتی ہے محسوسات کے آگے قدم رکھتے ہی اس پر رعشہ طاری ہوجاتا ہے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آگے کیا ہے، اور مذہب انسان کا وہیں سے ہاتھ پکڑتا ہے اور غیب (عالم غیر محسوس) کے سارے اسرار کو اس کے سامنے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے، سائنس کچھ نہیں بتا سکتی کہ دنیا کی ابتداء کیونکر ہوئی، مذہب آتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتا ہے ــــــ انسان مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے، اور اس پر کیا گزرتی ہے۔؟ سائنس اس کے جواب سے عاجز ہے اور مذہب اس کی تفصیل پیش کرتا ہے، دنیا کا آخری انجام کیا ہوگا۔؟ سائنس متحیر ہے کہ اس کا کیا جواب دے، مذہب آتا ہے اور اس حیرت کو مٹا دیتا ہے۔

سائنس یہ تو بتاتی ہے کہ عالم کس کے لئے ہے، لیکن خود انسان کس لئے ہے اس مقصد کو متعین کرنے سے وہ عاجز ہے، مذہب آتا ہے اور اس مسئلہ کو بھی صاف کردیتا ہے، الغرض مذہب کا جس عالم سے تعلق ہے، سائنس کی ہدایت کا چراغ اس کے حدود تک پہنچتے ہی گل ہوجاتا ہے، میلن ایڈورڈ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کہ:

"عالم کے ان قوانین کی نسبت یہ کہنا کہ یہ محض بخت و اتفاق کے نتائج ہیں، یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں ہیں جسے لوگوں نے محسوسات کا لقب دے رکھا ہے فزیکل سائنس جاننے والا ہرگز اس قسم کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ (بحوالہ الکلام مولانا شبلی)

اس کے بعد عوام الناس کا یہ خیال کہ سائنس کی جدید تحقیقات نے مذہب کی بنیادیں ہلا دی" جیساکہ گیزو نے غایت گستاخی کیساتھ لکھا ہے کہ:

"ہم نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کرکے اس کو سرحد پار پہنچا دیا۔"

(نعوذ باللہ تعالیٰ شانہٗ) کس درجہ جاہلانہ اور مضحکہ خیز ہے۔ کسی[1] نے خوب کہا ہے کہ:

([1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

"اگر خشکی کی ٹرین سمندر کے جہاز سے ٹکرا سکتی ہے تو سائنس بھی مذہب سے ٹکرا سکتی ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ جب دونوں کے حدود جدا جدا ہیں ایک کی تگ و دو محسوسات کے تنگ دائرہ تک محدود ہے اور دوسرا غیبی فضا کا شہباز ہے تو ان دونوں میں تصادم کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ حافظ شیرازیؒ سچ فرماتے ہیں ؎

عاقلاں نقطۂ پرکار وجود اند و لے ۔۔۔ عشق داند کہ دریں بادیہ سرگردانند

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس اور مذہب بالکل دو جداگانہ چیزیں ہیں نہ ان دونوں میں اختلاف ہے اور نہ ہو سکتا ہے، ہم سائنس کے ذریعہ آسمان کے تاروں کو گن سکتے ہیں، آفتاب کو ناپ سکتے ہیں، ہوا کو تول سکتے ہیں، سمندر کو خشک کر کے بادل بنا کر پانی برسا سکتے ہیں بلکہ ممکن ہے کہ آئندہ مردوں کو زندہ کرنے کی تدبیر بھی معلوم ہو جائے جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ احیاء موتیٰ[۲] ۔ (مُردے کو

---

[۱] میری مراد مولانا عبدالباری ندوی پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ سے ہے۔ مولانا نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ سورت میں ایک مقالہ "دینیات اور عقلیات" کے عنوان سے پڑھا تھا یہ رسالہ کانفرنس کی طرف سے شائع بھی کر دیا گیا ہے، ارباب تحقیق نے باوجود اختصار کے اس مقالہ کی کافی ستائش کی، حضرت مولانا تھانوی نے دین و بے دینی کے درمیان سدّ آہنی اسی رسالہ کو قرار دیا ہے، خاکسار نے بھی اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں مولانا کے اس مقالہ سے کافی نفع اٹھایا ہے۔ بلکہ مغربی مصنفین کے اقوال جو اس حصہ میں درج ہیں، ان کی معتول تعداد مولانا ہی کے مضمون سے نقل کی گئی ہے۔ ۱۲ منہ

[۲] دجّال کی حدیثوں میں اس کا ذکر ہے کہ منجملہ اور باتوں کے وہ مردے کو بھی زندہ کرے گا، حدیثوں کا صحیح ذخیرہ دجّال کی اس خصوصیت کے ذکر سے معمور ہے بلکہ دجّال کی یہ خصوصیت کہ چالیس دن کی مختصر مدت میں کرۂ زمین کے شمال و جنوب مشرق و مغرب کی ہر آبادی میں پہنچ جائیگا۔ یعنی بعد مسافت کے مسئلہ کو گویا درجہ صفر تک پہنچا دے گا۔ یا مون سون پر قابو یافتہ ہو کر جہاں چاہے گا پانی برسائے گا۔ آپ اگر غور کریں گے تو سائنس کے رجحانات ان چیزوں کی تکمیل کی طرف ہیں۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ریڈیو وغیرہ کا حاصل بُعد مسافت کی کمی کے سوا اور کیا ہے۔ بارش برسانے کی جدوجہد بھی سنا جاتا ہے کہ سائنس کی دنیا میں جاری ہے۔ پھر کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ سائنس کا انتہائی عروج ممکن ہے کہ دجّال ہی کے ہاتھوں پر مقدر ہو۔

زندہ کر دینے) پر بھی آدمی قادر ہو جائے گا، بلکہ زندہ کرے گا، دوسرے لفظوں میں اسی کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ :

" انسان زندگی کے قانون سے بھی واقف ہو جائے گا "

اور سائنس والوں کا بھی بیان ہے کہ ہم نے "تخم حیات" (پروٹوپلازم) کا پتہ چلا لیا ہے، کیمیا والے کہتے ہیں کہ تخم حیات کاربن، آکسیجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے تیار ہوتا ہے ـــــ تو سائنس یہ سب کچھ کر سکتی ہے اور ہم منتظر ہیں کہ وہ ایسا کرے کیونکہ ہمارے بہت سے ایمانی دعوؤں کی توثیق انہیں اکتشافات پر موقوف ہے۔ لیکن با ایں ہمہ مذہبی سوالات کے حل میں سائنس اسی طرح عاجز رہے گی جس طرح پہلے تھی اور اس وقت تک ہے، فرض کیجئے کہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ہم نے زندگی کو پیدا کر بھی لیا تو اس سے یہ مسئلہ کہاں حل ہوا کہ ان عناصر کی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے ٹھیک اسکی مثال ایسی ہے کہ زندگی کا راز کسی زمانہ میں یوں حل کیا گیا تھا کہ نر و مادہ کے باہمی اختلاط کا یہ نتیجہ ہے۔ لیکن اس وقت بھی یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس اختلاط سے یہ نتیجہ کیوں پیدا ہوتا ہے، اب بھی یہ سوال اسی طرح باقی رہے گا کہ کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔؟ کیا جو شخص اس سے واقف ہے کہ تخم کو مٹی میں ملانے اور پانی دینے سے پودا پیدا ہو جاتا ہے کیا اس نے اس سوال کو حل کر لیا کہ پودا کیونکہ پیدا ہوتا ہے۔؟ پروفیسر ٹنڈل نے بلفاسٹ کے لکچر میں ایک موقع پر کتنی اچھی بات کہی کہ :

" لیکن کیوں۔؟ اس کا جواب ہمیشہ کے لئے اسی طرح ناممکن رہے گا جس طرح کہ پہلے رہا ہے۔"

امجد حیدر آبادی نے بھی اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔

امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں
ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

الحاصل کسی شئے کے آغاز کا پتہ چلانا اور اس کے آخری انجام تک پہنچنا سائنس کی رہنمائی میں ناممکن ہے، چند قدم چل کر اس کو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، علی الخصوص جب حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور یہی حال انجام کا ہے، آئندہ کیا ہوگا، موجودہ قوانین کا آئندہ کیا حال ہوگا، اس کے آثار و نتائج کیا ہوں گے۔؟ اس کا بھی کوئی قطعی جواب سائنس نہیں دے سکتی۔ وہی ہکسلے جس نے آغاز کے متعلق انسان کے جاہل ہونے کا اقرار کیا تھا، اب انجام کے متعلق بھی اسی اعتراف کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے :

"عالم تو بڑی چیز ہے، سائینس کا معمولی قانون یہ ہے کہ جو پتھر بے سہارا ہوگا، اس کو زمین پر گر پڑنا چاہیئے، لیکن ہمیشہ گیا ہی ضرور ہوگا۔"
اس کے نزدیک یہ قانونِ قدرت نہیں بلکہ انسان کا وہمی اضافہ ہے اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"وہ ڈراؤنا لزوم اور ضروری ہونے کا قانون کیا ہے جس نے لوگوں کو اس قدر خائف اور وحشت زدہ بنا رکھا ہے، سچ پوچھو تو یہ ہمارے واہمہ کا ایک گھڑا ہوا بھوت ہے سائینس ہی کا یہ قانون ہے کہ پتھر جب بے سہارا ہوگا تو اس کو زمین پر گر پڑنا چاہیئے لیکن آئندہ وہ ہمیشہ گر ہی پڑے گا یعنی اس کے خلاف ہونا ناممکن ہے، یہ ایک ایسی زائد شئے کا اضافہ ہے جس کا نہ تو مشاہدہ اور واقعات میں نشان ملتا ہے اور نہ کہیں اور سے اس کا پتہ چلتا ہے۔"

—— یعنی یہ ایسا حکم ہے جسکی شہادت ہمارے حواس نہیں دیتے۔
سائینس کی یہ رائے تو انجام سے متعلق تھی، رہا آغاز اس کے متعلق میں نے چند اقوال پہلے بھی درج کئے ہیں، لیکن آخر میں ہکسلے ہی کے قول کو پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں —— وہ اپنی کتاب "اصول و نتائج" میں لکھتا ہے:

"وجود کی علّت اولیٰ کا مسئلہ میرے حقیر قوٰی کی دسترس سے باہر ہے۔ جتنی لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا ان میں سب سے بدتر ان لوگوں کے دلائل ہوتے ہیں جو آغازِ عالم کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں، مگر ان لوگوں کے مہملات ان سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے۔"

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم

عصر حاضر کے سیاسی نظریئے اور اسلام

سوشلزم، جمہوریت اور دیگر نظامہائے یورپ

حضرت علامہ مرحوم کا یہ نادر مقالہ آج سے تقریباً ۲۵ برس قبل شائع ہوا تھا جس میں موجودہ دور کے سیاسی نظریوں پر اسلام کی روشنی میں بڑی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظریاتی انتشار کے اس ہنگامہ پرور دور میں اس کا مطالعہ قارئین الحق کے لئے مفید ہوگا۔
(قاری سعید الرحمان راولپنڈی صدر)

★

علم کلام وہ فن ہے جس میں اصول دین کی حمایت کی جائے اور معترض ان پر شکوک و شبہات وارد کریں، ان کو دفع کیا جائے۔ لیکن کسی چیز کی حمایت و حفاظت ہر زمانہ میں ایک ہی طور سے نہیں کی جاسکتی، کیونکہ ہر زمانہ کے خیالات یکساں نہیں ہوتے۔ اس تغیر آباد عالم میں کسی چیز کو قرار نہیں، ہر وقت خیالات بدلتے رہتے ہیں، حسن و قبح کا انسانی معیار بدلتا رہتا ہے، چیزوں کی قدر و قیمت کا معیار بدلتا رہتا ہے، لیکن دین جو حق مطلق اور صداقت دائمی ہے، وہ ناقابل تغیر ہے، توحید، انبیاء، عالم غیب احکام الٰہی، آغاز عالم سے ان کے حقائق یکساں ہیں اور یکساں رہیں گے، اسی طرح معاملات کی صداقت اور اخلاق کی طہارت کا معیار ہمیشہ سے ایک ہے اور ایک ہی رہے گا، قتل ناحق اور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر تصرف میں لانا جس کے انواع چوری، ڈاکہ، غصب، خیانت، رشوت وغیرہ ہیں، ہمیشہ ممنوع رہے ہیں اور رہیں گے، جھوٹ کا برا اور سچ کا اچھا ہونا نہ کبھی بدلا ہے، اور نہ کبھی بدلے گا۔

اوپر کی سطروں کا خلاصہ یہ ہے کہ دین ایک غیر متبدل حقیقت ہے، اور انسانی خیالات

سیلاب ہمیشہ چڑھتا اترتا رہتا ہے، ایک ہی چیز جو کبھی اعتراض کا مورد تھی، دوسرے وقت میں مستحسن سمجھی جانے لگتی ہے۔ اور جو کبھی مستحسن تھی وہ دوسرے وقت میں قابلِ اعتراض بن جاتی ہے۔

غرض ان غیر متغیر دینی حقائق اور ان تغیر پذیر انسانی خیالات میں ایک کشاکش سی قائم رہتی ہے۔ علمِ کلام کا کام یہ ہے کہ اس کشاکش کو دور کرے لیکن اس کشاکش کو دور کرنے کا طریقہ بھی یکساں نہیں رہ سکتا، کیونکہ زمانہ کے خیالات اور ہر کوشش کرنے والے کی دماغی ساخت، ذہنی فعلیت اور طریق فکر یکساں نہیں ہوتا، اس لئے زمانہ کے تغیر اور ہر صاحب فکر کے طریق فکر کے اختلاف سے اس کشاکش اور تصادم کے رفع کرنے کا طریق بھی بدلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کا علم کلام دوسرے زمانہ کے علمِ کلام سے الگ رہا کیا ہے۔ کیونکہ حملوں کی نوعیت کے بدلنے سے ان کی مدافعت کی نوعیت بھی بدلنی ضرور ہے۔

کبھی آسمان کے خرق والتیام، جزء لایتجزیٰ، استطاعت مع الفعل وقبل الفعل، اور الواحد لایصدر عنہ الا الواحد کے مسائل نفیاً یا اثباتاً علمِ کلام کے اجزاء تھے، کبھی معجزات کا صدور نبوت کے ثبوت کا معیار تھا، کبھی قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت اسکی حقانیت کا آئینہ تھی، کبھی ان صداقتوں کے ثبوت کے دوسرے معیار پیدا ہو گئے، چنانچہ کبھی خرق عادت کی کثرت کسی دین کے ثبوت کا ذریعہ تھی اور کبھی خرقِ عادت کی سرے سے نفی دین کی صداقت کا معیار بنی، غرض کبھی وہمی یونانی فلسفیانہ خیالات کی عینک سے دین کو دیکھا گیا، کبھی اشراقی صوفیانہ نظریہ کی کسوٹی پر اس کو کسا گیا، کبھی منافع دنیاوی اور شواہد عقلی کی ترازو سے ان کو تولا گیا، اور آج یورپ کے افکار و خیالات سے ان کو جانچا جا رہا ہے۔

اسی جدید عہد کے متکلمین کی کوششوں پر ایک نظر ڈالئے جو سید احمد خاں اور مفتی عبدہ کے زمانہ سے آج کے دن تک میدانِ عمل میں آئے، تو معلوم ہو گا کہ ہر دفعہ کا علم کلام دوسرے وقفہ سے الگ ہوتا رہا، سید صاحب اور مفتی عبدہ کا عہد وہ تھا جب سائنس کی تحقیقوں نے مادیت کا زور پیدا کیا اور فطرت اور نیچر اور قواعد طبعی اور نیچرل لاز صداقت کا معیار بن گئے، معجزات کی نفی کی گئی یعنی ان کی تاویل کی گئی، جنت و دوزخ اور عقائد مابعد الطبعی کی باطنی تشریح کی گئی اور اسلام کا نام فطرۃ الہیہ ایسے معنوں میں رکھا گیا، جن معنوں میں نیچر کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب فطرت اور نیچر کی بجائے تمدن، تہذیب، طرز سلطنت اور رفاہ عام کے طور و طریق ایک دین کی صداقت اور معیاری ہونے کے دلائل ٹھہرائے گئے، یہ وہی زمانہ ہے جب الفاروق لکھی گئی، الجزیہ لکھا گیا، حقوق الذمیین ترتیب پائے، اسلامی شفاخانے

اور اسلامی کتب خانے وغیرہ مضامین اشرفیوں سے تولے گئے۔

اب گذشتہ جنگ عظیم نے جب کروٹ لی، تو خیالات کی دنیا میں بھی تزلزل آیا، سیاسیات کے رنگ بدلے اور انسانی حقوق کے نئے نقشے ترتیب پائے، پھر سوشلزم کی کامیاب دعوت نے جب روس کے تخت پر قبضہ کیا، تو اقتصادیات کے نئے عقائد لوگوں میں پھیلے، اور دینی حقائق کے معیار میں بھی ایک نئی تبدیلی آگئی۔

صرف پچھلے ساٹھ ستر برس کے سیاسی تغیرات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ متکلمین اسلام نے کیا کیا پہلو بدلے، سر سید تک کی تحریروں میں شخصیت پرستی کا زور تھا، اور شخصی سلطنت ہی خیر و برکت کا موجب رہی، سید جمال الدین افغانی نے لکھا، کہ اسلام کی خیر شخصیت عادلہ میں ہے، اسی پچھلے زمانہ کے ایک بڑے عالم باعمل کی تحریروں میں شخصی بادشاہی کو عین منتہائے اسلام ہونے کی تلقین بکثرت ملتی ہیں۔

لیکن ان دماغوں نے جو ابتدائے عہد جدید میں بیدار ہوئے، دستوری حکومت کو منشائے اسلام قرار دیا، اور پھر جمہوریت کا دور آیا جس میں اسلامی حکومت کو جمہوریہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، ابھی اسی جنگ میں جب جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی کا عروج تھا، اور بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ فسزم اس معرکہ میں کامیاب ہوکر نکلے گا، طبائع میں یہ میلان پیدا ہوگیا، کہ حکومت اسلامیہ کو ڈکٹیٹر شپ اور فسزم کے رنگ میں پیش کیا جائے، اب فسزم اور ڈکٹیٹر شپ کی ناکامی کے بعد پھر سوشلزم کا زور ابھرنے لگا ہے، اور اب موجودہ وقت وہ ہے جس کا علم کلام اسلام اور سوشلزم کے درمیان توفیق اور تطبیق ہے، بلکہ یہ ہے کہ سوشلزم کے مقابلہ میں اسلامی اصول سیاست و اقتصاد کی برتری ثابت کی جائے۔

تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ آج تو اس موضوع پر لکھنے والے بہت سے اہل قلم ہیں، لیکن ہندوستان میں سب سے پہلے راقم الحروف کو اسکی توفیق ملی، غالباً ۱۹۱۰ء میں اسلام اور اشتراکیت کے عنوان سے ایک مفصل مضمون الندوہ میں سپرد قلم کیا، پھر اسی مضمون کو الہلال کلکتہ کی ادارت میں شمول کے بعد ۱۹۱۲ء میں "الحریۃ فی الاسلام" کے عنوان سے ازسر نو لکھا، جو الہلال کے کئی نمبروں میں شائع ہوا، اسوقت تک اشتراکیت صرف تخیل اور نظریہ تھا، اس نے کوئی عملی صورت اختیار نہیں کی تھی، اسکی عملی صورت تو ۱۹۱۸ء سے ظاہر ہوئی، جب جنگ عظیم کے خاتمہ کے قریب روس نے بالشویک انقلاب کو کامیاب کیا۔

بروسی بالشویکوں کی کامیابی نے بہت سی قوموں کے افکار میں ہیجان پیدا کر دیا، اور بخصوصیت

کے ساتھ محکوم قوموں کے نوجوانوں کے دل و دماغ میں ایسی شر انگیزی پیدا کر دی ہے کہ سوشلزم ان کا مذہب اور مارکس اور اینجل کی تصانیف ان کا دینی صحیفہ بن گیا ہے، اور ان کے اندر اسکی اشاعت اور کامیابی کے لئے وہی جد و جہد اور ایثار و قربانی کی روح پیدا کر دی ہے، جو کبھی "مذہبی مجنونوں" کا خاصہ تھا۔

سوشلزم کی تحریک اگر صرف سیاسی و اقتصادی اصلاح طلبی کی چیز ہوتی، تو مسلمانوں کو چنداں اس سے اختلاف نہ ہوتا، مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کی تہ میں لادینی دعوت کام کر رہی ہے، وہ "قیصر" اور "خدا" دونوں کو ایک ساتھ تخت اور عرش سے اتارنا اور قیصر کے محل اور خدا تعالیٰ کے معبد دونوں کو ڈھانا چاہتی ہے۔ اور بقول اقبالؒ یہ وہ دین ہے، جس کا کلمہ لا الہ اور لا ملک ہے، اور اسلام کا کلمہ لا الہ الا اللہ اور لا ملک الا اللہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ سوشلزم ایک تخریبی تحریک اور اسلام ایک تعمیری دعوت ہے۔ لیکن ایک حیثیت سے یہ مسئلہ کلام کے علمی و نظری تنگنائے سے نکل کر عملی زندگی کا معاملہ بن گیا ہے۔

سوشلزم کی تحریک اگر صرف سیاسی و اقتصادی اصلاح طلبی کی چیز ہوتی، تو مسلمانوں کو چنداں اس سے اختلاف نہ ہوتا، مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کی تہ میں لادینی دعوت کام کر رہی ہے۔ وہ "قیصر" اور "خدا" دونوں کو ایک ساتھ تخت اور عرش سے اتارنا اور قیصر کے محل اور خدا تعالیٰ کے معبد دونوں کو برابر ڈھانا چاہتی ہے۔

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے، مگر حقیقت ہے کہ اسلامی دعوت کی وسعت جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ تک وسیع تھی، وہ گھٹتے گھٹتے صرف چند عقائد اور چند عبادات تک محدود ہو کر رہ گئی، بنی امیہ نے اپنے عمل سے سیاست کو دین سے خارج کر دیا، اور عباسیہ نے تہذیب و تمدن و آداب کو بھی دین کی ہمہ گیری سے الگ کر لیا، اس کے بعد ایرانی و ترکی و تاتاری سلاطین نے قرآن کے ساتھ آئین نوشیروانی اور تورۂ چنگیزی کا اضافہ کیا، وہ دین تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھتے تھے، مگر ان کی سیاست اور خراج و باج کے آئین قیصر و کسریٰ اور چنگیز و ہلاکو کے دستور و قواعد پر مبنی تھے، اس لئے یہ ہماری پچھلی سلطنتیں مسلمانوں کی تو ضرور تھیں، مگر اسلام کی نہ تھیں، یعنی ان کے فرمانروا مسلمان تھے، مگر ان کی حکومت کا قانون اسلامی نہ تھا، جس طرح آج انگریزی عہد میں بھی محمڈن لا جاری ہونے سے کوئی سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی تھی، تو کل صرف نکاح و طلاق و وقف وغیرہ قوانین کے اجراء سے سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی، الّا یہ کہ اس کے استعمال میں ہم ایک نوع کا مجاز اور تساہل برتتے ہیں۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ مسلمانوں نے اس اسلامی حقیقت کی تبدیلی کو آسانی سے مان، جنگ جمل، جنگ صفین، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حجاج کی لڑائی، معرکہ کربلا، واقعہ حرّہ، جس میں اہل مدینہ نے بنو امیہ

کے خلاف لڑائی لڑی۔ واقعہ قراء جس میں علمائے عراق نے بنوامیہ کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ واقعہ نفس زکیہ جس میں سادات و علمائے حجاز نے مل کر عباسیہ کے خلاف پُر زور بغاوت کی، یہ اور اس کے سوا دوسرے واقعات نے جن میں اصلاح و انقلاب کے علمبرداروں کو کامیابی نہیں ہوئی، خونریزی اور فتنوں کا دروازہ کھول دیا۔ اس لئے پچھلے متکلمین اور فقہاء نے یہ اصول بنالیا کہ ہر اصلاح طلبی میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ فتنوں کے نئے دروازے تو نہیں کھلتے، اور حالات بد سے بدتر تو نہیں ہوجائیں گے

ان اصلاح طلبوں اور انقلابیوں کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انقلاب سے پہلے انہوں نے انقلاب کی دعوت کا دور اپنے اوپر نہیں گزارا، اور زمین میں ہل چلانے سے پہلے زمین میں تخم ریزی شروع کردی، آخر اسی زمانہ میں ابومسلم خراسانی کی تحریک جس سے عباسیہ حکومت کا آغاز ہوا، اور اسماعیلیوں کی تحریک جس سے دولت فاطمیہ پیدا ہوئی، اور محمد بن تومرت کی تحریک جس سے موحدین مراکش کی سلطنت قائم ہوئی، کس طرح دعوت کی راہ سے بڑھی اور پھلی اور پھولی اور مدتوں قائم رہی، زمانہ کے انقلابات نے آج بہت سے امکانات پیدا کر دیئے ہیں، ہر جگہ شخصی سلطنتوں کے تخت خالی ہو گئے، دستوری اور جمہوری اور عوامی سلطنتوں کے آئین پر حکومتیں قائم ہو رہی ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی اصول سلطنت قائم کیوں نہیں ہوسکتی، اس راہ کے جو موانع ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

۱۔ مسلمان ملکوں کا بڑا حصہ نامسلمانوں کے قبضہ میں ہے، اس لئے ان مسلط قوتوں سے ٹکرائے بغیر اس میں کامیابی نہیں ہوسکتی۔

۲۔ مسلمان ملکوں میں جو آزاد بھی ہیں وہ نامسلمانوں کی سیاست اور مادی و ذہنی برتری کے سامنے عاجز و درماندہ ہیں۔ یعنی ان کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں، وہ انہی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور انہی کے کانوں سے سنتے ہیں، وہ اسی کو خیر سمجھتے ہیں جس کو یورپ خیر سمجھتا ہے۔ اور اسی کو شر جانتے ہیں جس کو یورپ شر کہتا ہے۔

۳۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی سیاست و حکومت کے آئین و اصول و دستور سے خود مسلمان واقف نہیں، صدیوں کی ظلمت و جہالت نے اسلام کے نور پر پردے ڈال دیئے ہیں۔ اور قیصری و کسرائی و خاقانی دستور و آئین اس طرح مخفی ہوگیا ہے، کہ آج ہم کو اس قیصریت و کسرائیت میں جس کو مٹانے کو اسلام آیا تھا اور اسلام میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اسلامی حکومت و سیاست کے مولفین میں بڑا نام قاضی ماوردی شافعی کا ہے، وہاں بھی اصل حقیقت مستور ہے، ایک دوسرے حنبلی عالم کی کتاب بھی چھپ گئی ہے، اس میں بھی حقیقت کا پتہ نہیں، ابن خلدون کے مقدمہ میں بہت کچھ ہے

مگر ماضی کی داستان سرائی نے حال و مستقبل پر پردہ ڈال دیا ہے۔

حق یہ ہے کہ اس باب میں ہندوستان کے مصلح اعظم شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ ازالۃ الخفاء عن تاریخ الخلفاء صرف علم کلام اور مناظرہ کی کتاب نہیں ہے بلکہ اسلامی اصول سیاست خلافت پر بڑی دقیق اور محققانہ کتاب ہے، لیکن مطالب دوسرے مضامین کے ساتھ متفرق اور بکھرے دیئے ہیں، مولانا اسمٰعیل شہید پہلے شخص ہیں جنہوں نے منصب امامت میں اسلامی اور غیر اسلامی اصول و آئین حکومت کو خالص کر کے دیکھا، اور مسلمانوں کی حکومتوں اور سلطنتوں کے مدارج اور مراتب مقرر کئے۔

اب جب مسلمانوں کی آنکھیں کھلی ہیں تو نظر آتا ہے کہ یورپ کے پیدا کردہ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ نے ایسی اہمیت پیدا کر لی ہے، اور وہ دماغوں پر اس طرح مسلط ہے کہ ان ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اپنے لئے کسی اصول و آئین کا قیام اُن کا سر تا سر محال نظر آتا ہے، اور جہاں وہ اکثریت میں ہیں، یورپ کے پیدا کردہ مسئلہ وطنیت نے اُن کو از خود فراموش بنا رکھا ہے، اور مسلمان کی زندگی ان دونوں باطل نظریوں اور عقیدوں کے نذر ہو رہی ہے۔ اور ہندوستان کی وہ اسلامی تحریک جو ان دونوں سے خود دارانہ علیحدگی چاہ رہی ہے، وہ ابھی تک ایجابی کی بجائے سلبی قوت ہے۔ اور دائمی اور پائیدار زندگی ایجابی و تعمیری قوت کے اندر مضمر ہے۔ بہر حال توقعات قائم ہیں، اصلاح کی کوششیں جاری رہیں تو ممکن ہے کہ دوسروں کی نقالی کی بجائے خود اپنے اسلاف اوّلین کے کارناموں پر نظر پڑے اور یونانی و رومانی قانون و طریق عدل کی جگہ کتاب و سنت اور قانون اسلام کی اتباع کا شوق پیدا ہو لیکن اس کے لئے اصلاحی جدوجہد اور اسلامی سیاسیات پر صالح لٹریچر لکھ کر پھیلانے کی ضرورت ہے

اس موقع پر ایک واشگاف بات کہنی ضرور ہے، بعض اہل قلم اس بات کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہ موجودہ جمہوریت کے اصول و آئین کو ایک ایک کر کے لیں اور اس کا سراغ اسلام میں لگائیں اور اسلامی شریعت کی دلیلوں سے ثابت کریں۔

دوسری طرف یہ کوشش جاری ہے کہ خلافت راشدہ کے انتخابی و انتظامی طریقوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ نکالیں اور ان کو جامد اصول کی طرح تسلیم کر لیں، جیسا کہ ہمارے متکلمین اور فقہائے سیاست نے خلفاء اربعہؓ اور امیر معاویہؓ کے طریق انتخاب اور تسلط و استیلاء کو ہمیشہ کے لئے دائمی اصول قرار دے لیا ہے حالانکہ پیش آجانے والے واقعے کسی مذہب کے ایسے مقررہ اصول نہیں بن سکتے جن میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی جس طرح جہاد فرض ہے، اور اس کے آلات جو عہد خلافت میں رائج تھے، حملہ اور دفاع کے آلات اُن میں محدود نہیں، زمانہ کے حالات کے ساتھ ان میں ترقی اور تغیر ممکن ہے۔

انتخاب کے نئے آئین بن سکتے ہیں، قانون سازی اور اختلاف آراء کے موقع پر فیصلہ کے طریقوں میں نئی راہیں نکالی جا سکتی ہیں۔ اجماع اور قیاس کے اصولوں کے بہت سے نئے فیصلوں کی گنجائش ہے مگر ضرورت ہے کہ یہ سب کچھ کتاب و سنت، قضایائے خلفائے راشدینؓ اور مسلمات فقہائے اسلام پر اسی طرح مبنی ہوں، جسطرح یورپ کے ہر قانون کی بنیاد رومن لا کے اصولوں پر ہے۔

ہم نے جہاں تک اسلام کے سیاسی اصولوں کا جو کتاب و سنت میں پھیلے ہیں مطالعہ کیا ہے یہ چیز نظر آتی ہے کہ چند بنیادی اصول ایسے ہیں جو اسلام میں اصول کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے انحراف ہی نہیں، مثلاً یہ کہ :

۱۔ خلیفہ کے انتخاب میں کہ وہ بہتر سے بہتر ہو جتنی کاوش ممکن ہو کی جائے، پھر انتخاب کے بعد اس کے احکام کی جو کتاب و سنت اور مصالح مسلمین کے خلاف نہ ہوں اس کا حکم واجب الاتباع ہے۔

۲۔ امور مہمہ میں جو منصوص نہ ہوں اہل حل و عقد سے شوریٰ کیا جائے۔

۳۔ بیت المال خلیفہ کی ذاتی ملک نہیں، وہ صرف مصالح مسلمین کے لئے ہے، اس میں ہر ناجائز تصرف خیانت ہے، اور بیت المال اور اس کے اصول و قواعد اسلامی سیاست اقتصاد کے نہایت ہی اہم اصول ہیں۔

۴۔ سلطنت کے نظم و نسق میں حد درجہ سادگی اور کم خرچی اختیار کی جائے۔

۵۔ عہدہ دار اور اہل منصب میں ادائے فرض کے اندر پوری امانت برتی جائے، ان میں سے ہر فرد اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ سمجھے۔

۶۔ عہدہ داران سلطنت کے لئے مقررہ وظیفہ کے علاوہ رعایا سے کسی کام کا تحفہ نذرانہ اور اخذ زر قطعاً ناجائز ہے۔

۷۔ رعایا سے شرعی ٹیکس کے علاوہ دوسرے قسم کے غیر شرعی ٹیکس نہیں لئے جا سکتے فقہ اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

۸۔ حکام پر پورا پورا عدل و انصاف فرض ہے، عدل و انصاف کی راہ میں رشوت طرفدار بے انصافی، ظلم گناہ کبیرہ ہے۔

۹۔ کاشتکار اور زمیندار کے درمیان اتنا ہی تعلق ہے، جتنا ایک مزدور یا اجارہ دار اور مالک

کے درمیان ہے، اس کے تفصیلی احکام فقہ کی کتابوں میں ہیں۔

۱۰۔ اسلامی حکومت کے اندر ہر مسلمان جو معذور نہ ہو، اس کا سپاہی ہے۔

۱۱۔ غیر مسلم رعایا کی حفاظت جان و مال و مذہب کے مسلمان ذمہ دار ہیں، اور ان سے مصالحت کے وقت جو شرطیں قرار پاتی ہوں ان کو پورا کرنا حکومت پر واجب ہے۔

۱۲۔ قانون اور حدود میں ہر ادنیٰ و اعلیٰ برابر ہے۔

یہ چند سرسری واقعات ہیں، تلاش سے ان میں کچھ اور اضافہ ہو سکتا ہے، ان دفعات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اسلامی اصول سیاست ظاہری ہیئت و شکل پر زیادہ زور نہیں دیتا۔ بلکہ اس کا اصلی زور روح اور اسپرٹ پر ہے، اس اصلی روح اور اسپرٹ کی بحالی کے ساتھ اگر غیر قوموں سے نظم و نسق کے کچھ قواعد لئے جائیں، تو کچھ حرج نہیں، جیساکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق میں کھائی کھود کر حصار بنا لینے کا طریقہ اہل فارس سے حاصل کیا، آلات جنگ میں منجنیق کا استعمال اہل یمن سے عہد نبوی ہی میں مسلمانوں نے سیکھا، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حکومت کے دفاتر کا طریق ایرانیوں اور رومیوں سے اخذ کیا، زمین کی پیمائش اور بندوبست ایرانی زمینداروں کے ذریعہ سے رائج کیا گیا، ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ نظم و نسق حکومت کے وہ طریقے جو اسلامی روح سیاست کے منافی نہ ہوں وہ غیر قوموں سے حاصل اور نقل کئے جا سکتے ہیں، اور آج یورپ کے ان انتظامی اصولوں اور طریقوں کو جو اسلامی اصول کے خلاف نہ ہوں، قبول کیا جا سکتا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان علماء جن کی طبیعتوں میں امنگ ہے وہ ان مسائل پر تحقیقی مضامین لکھیں اور مسلمانوں کی نئی سیاسی زندگی کیلئے نئی راہیں کھول لیں۔

ملفوظات

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رح

مہاجر مکی

بروایت حضرۃ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح

★

فرمایا : ارشاد باری ہے : یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ۔ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔ اس میں عجب کا علاج ہے یعنی انکو عبادت کر کے ناز نہیں ہوتا، دوسری جگہ ارشاد ہے : قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ مطلب یہ کہ ان میں باوجود عبادت کے پھر خوف ہے، عجب نہیں۔ ایک مسئلہ یہاں اور مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ جو عمل کو ہیچ سمجھے گا، ثمرات کا منتظر نہ ہوگا تو اس میں اسکی بھی تعلیم ہے کہ اعمال کے ثمرات کا انتظار نہ کرو، جیسے آجکل اکثر کی یہ حالت ہے کہ دو چار روز ذکر کیا اور منتظر ہوئے تجلی کے، حضرت حاجی صاحب رح ان تجلیات کے متعلق فرماتے تھے کہ حجاب نورانی اشد ہیں حجاب ظلمانی سے، کیونکہ سالکین کو جو انوار[1] نظر آتے ہیں وہ ظاہر ہے خدا تو نہیں غیر خدا ہیں۔ مگر یہ عجیب ہونے کے سبب انکی طرف توجہ کرتا ہے ان سے مزے لیتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات انکو مقصود سمجھنے لگتا ہے بخلاف حجاب ظلمانی کے کہ انکی طرف ایسا التفات نہیں ہوتا اس لئے وہ اشد ہیں، مگر لوگ ان ثمرات مانعہ کو ہی چاہتے ہیں اور انہی کو مقصود سمجھتے ہیں، سو ان کے آنے کا ہرگز قصد نہ کرے اور اگر بلا قصد آئیں[2] تو انکی طرف التفات

---

[1] لطائف بھی حجب ہیں، حجب نورانیہ حجب ظلمانیہ سے اشد ہیں۔ دنیا میں حق تعالیٰ کی رویت کا ادراک نہیں ہوتا نہ نظر سے نہ قلب سے۔ ہاں لطیفہ قلب کیطرف توجہ رکھنا چاہیے کیونکہ حدیث میں قلب کا ذکر ہے اور اسکی طرف توجہ کا اثر یہ ہے : مَنْ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ مُقْبِلًا عَلَیْهِمَا۔ یعنی جس شخص نے حضور قلب سے دو رکعت نماز پڑھی سبحان اللہ حدیث کا کتنا ادب ہے کیا آج کوئی شیخ نقشبندی بھی ایسا ہے۔ غرض سالک کو حضرت عارف کے قول پر عمل کرنا چاہیے

[2] حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمہ را

(استمداد التوبہ صہ)

نہ کرے۔ (حضرت حاجی صاحبؒ کا قول یہی ہے کہ ان تجلیات و انوار میں کسی کیطرف التفات نہ کرے۔
حضرتؒ کا مذاق سلف کے مطابق تھا۔ سلف کا فیصلہ اس باب میں یہ ہے کُلُّ مَا خَطَرَ بِبَالِكَ
فَهُوَ هَالِكٌ وَاللّٰهُ اَجَلُّ مِنْ ذٰلِكَ۔ تمہارے دل میں جو بھی خطرہ آئے جس میں انوار و تجلیات بھی داخل
ہیں، وہ سب فانی ہیں، اور اللہ سب سے اجل اور منزہ ہے۔ ان تحقیقات کو غور سے دیکھا جائے
تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؒ امام وقت تھے۔ کما قال حضرت حکیم الامت تھانویؒ، استمرار التوبہ ص۱۰)
جیسے بچے کو لڈو دے کر یا پیسہ دے کر بہلا دیتے ہیں، اسی طرح مبتدی سالک کو اس رنگ آمیزی سے
بہلایا کرتے ہیں کہ نشاط سے کام میں لگا رہے، سو مقصود کام ہی ہے، اس لئے اکثر یہ انوار عقلاء کو
نہیں دکھلائے جاتے، بلکہ کم عقلوں کو دکھلائے جاتے ہیں، تاکہ ذکر اللہ کا چکہ لگ جائے اور
آگے قدم بڑھائیں، میں جو ان انوار کی نفی کر رہا ہوں، وہ درجہ مقصودیت ہیں، ورنہ فی نفسہ وہ محمود ہیں۔
گو مقصود نہیں، انکو مذموم نہ سمجھنا چاہیئے، اگر خود آئیں آنے دو۔ ان کے دور کرنے میں بھی پریشانی
نہ اٹھاؤ، اگر نہ آئیں تو مغموم مت ہو، کیونکہ مقصودیت کے درجہ میں تو ہیں نہیں، نہ آئیں بلا سے مت
آؤ (خیر المال للرجال ص۵۵)

فرمایا: ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ نے ایصال ثواب کے بارے میں جسکے تقسیم،
عدم تقسیم کے باب میں کوئی نص قطعی نہیں اور اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہوا ہے۔ یہی فرمایا تھا کہ
ہم کو اللہ تعالیٰ سے امید یہی ہے کہ جب ہم چند آدمیوں کو ایک عمل کا ثواب پہنچاتے ہیں تو سب کو برابر
ہی پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ کمی تھوڑا ہے۔ (آداب المصاب تسلیۃ الاحباب ص۳۲) حدیث قدسی
ہے اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ۔ یعنی میں اپنے بندے کے گمان کے نزدیک ہوں، اس لئے حضرت
حاجی صاحبؒ کے قول پر یقین رکھنا مناسب ہے۔

فرمایا: ایک شخص حضرت حاجیؒ کے پاس آیا اور شکایت کی کہ حضرت مجھے قبض رہتی ہے،
کسی طرح بسط نہیں ہوتا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ذکر جہر سے کیا کرو، تو وہ کیا کہتا ہے کہ حضرت
میں تو نقشبندی ہوں جہر کیسے کروں، آپ نے فرمایا کہ اچھا نقشبندی ہو تو جاؤ۔ پھر اس نے ذکر جہر
شروع کیا، بس جہر کرتے ہی بسط ہوگیا۔ اب بتلایئے اس شخص کی طبیعت کو ذکر جہر سے مناسبت
تھی مگر اس کے شیخ نے ذکر خفی ہی تجویز کیا جس سے نفع نہ ہوا حضرت حاجی صاحبؒ نے پہچان
لیا کہ اسکو جہر سے مناسبت ہے، وہی تجویز فرمایا مگر وہ حضرت نقشبندی ہونے کا عذر کرنے
لگے۔ یہ نہایت داہیات ہے، شیخ کامل جو تجویز کرتا ہے۔ طالب کو اس پر بلا تردد و شک عمل

کرنا چاہیئے کیونکہ وہ صاحب بصیرت ہوتا ہے، طالب کی استعداد کو پہچانتا ہے اور پہچان کر نسخہ تجویز کرتا ہے تو خوب سمجھ لو کہ ذکر جہر نقشبندیت کے منافی نہیں اور نہ ذکر خفی چشتیت کے منافی ہے مقصود دونوں کا ایک ہے اور دونوں کو طالب کی استعداد کے موافق جو طریقہ مفید ہو بتلانا چاہیئے۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ چشتیہ کے مذاق پر تخلیہ کا اہتمام غالب ہے اور نقشبندیہ کے مذاق پر تحلیہ کا اہتمام غالب ہے۔ (زکوٰۃ النفس ص۳۱)

فرمایا: وصول جب ہوتا ہے، دفعۃً ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایک بار خدا کا نام اس طرح دل سے نکلتا ہے جو سالک کو واصل کر دیتا ہے۔ اس لئے جتنا ہو سکے اسکو بیکار نہ سمجھو۔ قاعدہ سے یا بے قاعدہ سے، ناغہ سے یا بلا ناغہ کرتے رہو، ایک دن عنایت ہو جائے گی، حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں ؎

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی گر پہنچے وہاں گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

دیکھو اگرچہ پیٹ آخری لقمہ سے بھرتا ہے۔ لیکن پیٹ بھرنے میں پہلے لقمہ کو اتنا دخل ہے جتنا آخری لقمہ کو، اسی طرح واصل اگرچہ آخر میں ایک دفعہ اللہ کا نام لینے سے ہوتا ہے، لیکن اس میں پہلی مرتبہ اللہ کہنے اور ذکر و شغل کو بھی دخل ہے۔ (زکوٰۃ النفس ص۱۸، ثمرۃ الآخرۃ ص۵۶، الدنیا والآخرہ ص۳۹)

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ (الانعام آیت ۷۵ تا ۷۸) اور ہم نے ایسے ہی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات دکھلائیں تاکہ وہ عارف ہو جائیں اور تاکہ کامل الیقین کرنے والوں سے ہو جائیں۔ پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا، آپ نے فرمایا کہ یہ میرا رب ہے سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے، سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرتا رہے تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں، پھر جب آفتاب کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے یہ تو سب میں بڑا ہے، سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا: اے میری قوم بیشک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں، مشہور

تفسیر تو یہ ہے کہ یہ ارخاءِ عنان بطور الزام ہے کہ ستاروں کو دیکھ کر فرمایا ہاں تو یہ خدا ہے پھر جب وہ غروب ہوگئے تو ان کے نقائص کو ظاہر کر کے توحید کو ثابت کیا کہ خدا بھی کوئی ایسا ہوتا ہے کبھی عالی کبھی سافل، ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کوکب میں اول ظاہر پر نظر پڑی۔ اسکی نسبت فرمایا: هٰذَا رَبِّیْ۔ پھر مظہر کی طرف التفات ہوا۔ اسکی نسبت فرمایا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْن۔ مطلب یہ تھا کہ اس کوکب کے اندر جو مجھے نظر آرہا ہے وہ میرا خدا ہے اور تم جو کوکب کی پرستش کرتے ہو میں اس سے بیزار ہوں، غرض عارفین مخلوق کو مرآۃ سمجھتے ہیں، سو دوسرے لوگ تو اول مرآۃ کو دیکھتے ہیں، اور عارفین اول مرآۃ کے اندر محبوب کو دیکھتے ہیں، تبعاً مرآۃ پر بھی نظر پڑ جاتی ہے (المورد الفرسخی فی المورد البرزخی صـ۹۶)

فرمایا: حضرت حاجی صاحبؒ کے ایک مرید بیان کرتے تھے کہ حضرت ایک مرتبہ حرم میں تشریف رکھتے تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دوسرے شخص کو مار رہا ہے، ہم لوگ سمجھتے تھے یہ کوئی نوکر ہے، حضرتؒ نے فرمایا یہ پیر مرید ہیں اور فرمایا دیکھو پیر ایسے ہوتے ہیں کبھی ہم نے بھی تم لوگوں کو مارا ہے۔ (ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ شیخ مرید کو اٹھک بیٹھک کرا رہے تھے (ربار القارہ) واقعی حضرتؒ کو اس قدر رحمت اور شفقت تھی کہ کہیں نہ دیکھی نہ سنی ۔

ہم نے الفت کی نگاہیں دیکھیں جانیں کیا چشمِ غضبناک کو ہم

میں نے حضرتؒ کو دیکھا کہ اپنے مریدوں کیساتھ وہ برتاؤ فرماتے تھے جیسا کہ لوگ اپنے پیروں کیساتھ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ حضرت سے فیض زیادہ ہوا۔ خیر یہ تو حضرت کی خاص حالت تھی مگر مجھ کو ان حضرت پیر کے قصہ سے استدلال کرنا ہے کہ وہ مرید بڑی خوشی سے پٹ رہا تھا جو بدوں محبت کامل کے اپنے اختیار سے کوئی انسان اسکو گوارہ نہیں کرسکتا، اور اس محبت کا منشاء صرف یہی امر ہے کہ اس کو اللہ والا بلفظ دیگر کامل الایمان سمجھتے ہیں۔

حضرتؒ فرماتے تھے کہ ایک مولوی صاحب فرماتے تھے کہ خدا جانے یہ فقیر کیا گھول کر پلا دیتے ہیں، ہم طالب علموں کو کھلاتے ہیں، پہناتے ہیں، سبق پڑھاتے ہیں، کتاب اپنے پاس سے دیتے ہیں، ان کے تمام ناز نخرے اٹھاتے ہیں، اور جب پڑھ لکھ کر چلے جاتے ہیں تو کوئی پوچھتا نہیں، اور ان فقیروں کے پاس جو آتا ہے، منہ سے بولتے تک نہیں، وہ خانقاہ میں پڑے ہیں اور ان کو خبر بھی نہیں ہے، کبھی شاہ صاحب ہنس پڑے تو عید آگئی، برسوں کے بعد کچھ بتلا دیا تو بہت ہی خوش ہیں۔ حالانکہ پیر صاحب پر کونسی محنت پڑی، ذرا زبان ہلا دی، سارا محنت مرید ہی کرتا ہے، نہ

اس کے کھانے کی خبر اور نہ محنت کی خبر، خدمتیں علیحدہ کرو، اگر پیر کے ہاں بھینس ہے تو سانی کرو، چارہ لاؤ اور بھینس چراؤ اور پیر جب چاہیں بھینس کی وجہ سے مرید کو نکال دیں، جب چاہیں ماریں مگر وہ ہے کہ ٹلتا نہیں، زندگی تک تو یہ حال رہتا ہے اور جب پیر صاحب مر گئے، بیوی بچوں کو چھوڑ کر قبر کا مجاور بن گیا۔ غرض خدا جانے کیا پلا دیتے ہیں، کہ وہ سر بسر ہو کر لپیٹ جاتا ہے۔ حضرت ان کے پاس ایک مقناطیس ہے، وہ اس سے جذب کر لیتے ہیں، وہ ہے خدا تعالیٰ کی اطاعت۔ شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

توہم گردن از حکم داور مپیچ کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

تو بھی حق تعالیٰ کے حکم سے گردن نہ پھیر کہ تیرے حکم سے کوئی گردن نہ پھیرے گا، عارف رومیؒ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسد از وے جن و انس و ہر چہ دید

جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور اس نے تقویٰ اختیار کیا ہے تو اس سے جن و انس اور جو چیز اسکو دیکھتی ہے، ڈرتی ہے۔ (الاتفاق صـ۳۲)

فرمایا: ایک دفعہ مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ کو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں زیادہ دیر لگ گئی تو اٹھتے وقت بطور معذرت کے حضرتؒ سے عرض کیا کہ آج حضرت کا بہت ہرج ہوا، کیونکہ یہ وقت عبادت کا تھا، فرمایا کہ میاں کیا تسبیح ہلانا ہی عبادت ہے، دوستوں سے باتیں کرنا بھی تو عبادت ہے۔ کیونکہ اس میں تطییب قلب مسلم ہے، اور ایک بار میرا نام لے کر فرمایا کہ میاں اشرف علیؒ جب ہم مجلس میں باتیں کرتے ہوں۔ اس وقت بھی تم ہمارے باطن کیطرف متوجہ رہا کرو۔ یہ مت سمجھنا کہ اس وقت تو باتوں میں مشغول ہیں۔ اس لئے باطن سے فیض نہ ہوگا، بھائی ہمارا باطن اس وقت بھی ذکر میں مشغول رہتا ہے۔ تو بات کیا ہے، اس کا راز یہی ہے کہ کامل باتیں بھی عبادت ہی کی نیت سے کرتا ہے۔ اس کا باطن اس وقت بھی مشغول بحق ہوتا ہے، اسی لئے اسکو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ اب خاموشی کا وقت ہے، اور اس وقت بولنے کی ضرورت ہے، اس وقت مزاح کی ضرورت ہے، تو اس کا قول و فعل عبادت و ذکر سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی لئے کامل کو بعض مزاح اور زیادہ باتوں میں مشغول دیکھ کر اپنے اوپر قیاس کر کے اس پر اعتراض نہ کرنا چاہئے، جن باتوں کو تم فضول سمجھتے ہو وہ کسی حکمت یا ضرورت کی وجہ سے ان میں مشغول ہوتا ہے ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

تجربہ کار آدمی کی حالت کو غیر تجربہ کار آدمی نہیں سمجھ سکتا، لہذا بات کو طول نہ دے اور زبان بند کر کیونکہ

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

لوگوں کے کانوں کو اپنی طرح قیاس نہ کر کیونکہ شیر اور شِیر ایک ہی طرح لکھتے ہیں، لیکن شیر ایک تو خونخوار
نام ہے، اور شِیر دودھ کو کہتے ہیں۔ اور ان میں بڑا فرق ہے۔ بعینہٖ تم میں اور اولیاء اللہ میں زمین
مان کا فرق ہے۔ ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ (تفاضل الاعمال ص۱۳، ماعلیہ البصر ص۲۲)

فرمایا: ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ ایک مرتبہ بلا کے نعمت ہونے پر تقریر فرما رہے تھے،
وقت یہ مسئلہ ہم لوگوں پر منکشف ہو رہا تھا، اور سب بلائیں نعمت معلوم ہوتی تھیں، اسی وقت
ایک شخص آیا جسکا ایک ہاتھ زخم کی وجہ سے گلا ہوا تھا، اور اس نے آکر دعا کی درخواست کی
مجھے اس بیماری سے بہت تکلیف ہے، اللہ تعالیٰ سے شفاء کی دعا فرمائیے۔ اس وقت ہم لوگوں
فکر ہوئی کہ حضرت نے ابھی بلا کا نعمت ہونا بیان فرمایا ہے۔ اب دیکھیں اس کیلئے رفع بلاء کی کیونکر
فرمائیں گے۔ کیونکہ رفع بلاء کی دعا کرنا تو اس تقریر کی بناء پہ زوال نعمت کی دعا کرنا ہے، مگر عارفین کسی
پہ نہیں رکتے، کیونکہ ان کے سامنے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ حضرتؒ نے فوراً فرمایا کہ سب
بان دعا کریں اور پکار کر یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ یہ بلاء بھی نعمت ہے مگر یہ لوگ
نے ضعف کا سبب اس نعمت کا تحمل نہیں کر سکتے۔ اس لئے درخواست کرتے ہیں کہ اس نعمت
ت عافیت سے مبدل فرما دیجئے۔ یہ طرز دعا سن کر ہماری آنکھیں کھل گئیں کہ سبحان اللہ کسطرح
کو جمع کیا کہ بلاء کا نعمت ہونا بھی باقی رکھا اور اس کے رفع کی دعا بھی فرما دی اور کس خوبی سے اس
کا ادب ملحوظ رکھا، حیات میں اس کا مشاہدہ ہے کہ بھنا گوشت نعمت ہے مگر ضعیف المعدہ
تحمل نہیں کر سکتا۔ اسکو ساگودانہ دیا جاتا ہے۔

دوسرے بلاء اور مصیبت میں بھی فرق ہے۔ بلاء کے معنی امتحان کے ہیں اور مصیبت وہ
بن سے پریشانی ہو اور حضرت حاجی صاحبؒ نے بلاء کو نعمت فرمایا تھا نہ کہ مصیبت کیونکہ
بیت تو نقمت ہوتی ہے اور اس کا سبب معاصی ہوتے ہیں اور بلاء سے محبین کا امتحان مقصود
ہے جو رفع درجات کا سبب ہے، اسی لئے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقطۂ بلاء
ہے، اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ۔ یعنی لوگوں میں شدید تر بلاء کے
ار سے انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر وہ لوگ جو آپ کے مماثل ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے مماثل
(ارضاء الحق حصہ اول ص۲۵، ضرورت الاعتناء بالدین ص۲۳)

---★---

تحریر : علامہ محمد اسد (حال متوطن مراکش)

ترجمہ : محمد معین خان بی۔ اے (عثمانیہ)

علامہ محمد اسد صاحب کی کتاب کی تازہ قسط پیش خدمت ہے۔ یہ کتاب کے پہلے باب " THE OPEN ROAD OF ISLAM " کا ترجمہ ہے۔ مضمون کی مناسبت سے میں نے اس کا عنوان " اسلام کا مقصد و منہاج " رکھا ہے۔ غالباً آپ بھی اسے پسند فرمائیں گے۔ مضمون ذرا منطقی اور فلسفیانہ ہے۔ اور اس میں ادق قسم کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ قارئین الحق کو ذہنی الجھن سے بچانے کی خاطر میں نے بعض بعض جگہ اصل انگریزی الفاظ توسین میں درج کر دئے ہیں۔ (محمد معین خان)

---★---

موجودہ دور کے سب سے مخصوص نعروں میں ایک " تسخیر کائنات " کا نعرہ بھی ہے۔ ذرائع حمل و نقل نے آج جو حیرت انگیز ترقی کرلی ہے وہ گذشتہ نسلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی ہوگی حمل و نقل کے ان ذریعوں سے اسباب و اشیاء کو اس قدر وسیع پیمانہ پر اور اتنی سرعت کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرنا شروع کر دیا ہے کہ نوع انسانی کی پوری تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ اس ترقی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کی تمام قومیں معاشی اعتبار سے ایک دوسرے کی دست نگر ہو گئی ہیں، صورت حال تو یہ ہے کہ آج کوئی قوم دوسری قوموں سے الگ تھلگ اور بے تعلق نہیں رہ سکتی، وہ دن گئے جبکہ معاشی ترقی صرف مقامی ہوا کرتی تھی۔ اب تو اس نے عالمی نوعیت اختیار کرلی ہے۔ کم از کم اس کے رجحان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہ تو سیاسی حدود ہی کو ملحوظ رکھتی ہے۔ اور نہ جغرافیائی بُعد و مسافت کو۔ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ نہ صرف اشیائے تجارت ہی کو منتقل کرنے کی ضرورت روز بروز بڑھتی جاتی ہے، بلکہ افکار و ثقافتی اقدار کو منتقل کرنے کی ضرورت میں بھی یوماً فیوماً اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ مسئلہ کا یہ پہلو[1]

---

[1] راقم مرتب کو بھی اس کے بعض مقامات سے الجھاؤ ہوا مگر مجموعی لحاظ سے مفید سمجھ کر شائع کیا جارہا ہے۔ (سمیع الحق)

خالص مادی پہلو کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہم ہے۔ یہ دونوں —— معاشی اور ثقافتی —— قوتیں جہاں رہ گذر
کل پر لمبا اوقات دوش بدوش گامزن نظر آتی ہیں، وہاں ان کے قواعد حرکہ میں ایک نمایاں فرق بھی دکھائی
دیتا ہے۔ معاشیات کے مبادی قوانین کا اقتضاء یہ ہے کہ قوموں کے مابین تبادلۂ اشیاء کا عمل باہمی
بنیاد پر ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم سدا خریدار بنی رہے اور دوسری صرف
تاجر۔ بلکہ دونوں قوموں کو بالآخر داد و ستد کے دونوں رول ایک ساتھ انجام دینے پڑتے ہیں۔ اس سے
کوئی بحث نہیں کہ یہ رول براہِ راست ادا کئے جاتے ہیں یا دیگر معاشی عوامل کی وساطت سے انجام دیے
جاتے ہیں۔ لیکن ثقافت کے میدان میں تبادلہ اشیاء کے اس آہنی قانون کی بجا آوری ناگزیر نہیں۔ یا کم از کم
یہاں اس قانون کی پابجائی ہمیشہ آشکارا نہیں ہوا کرتی۔ اس چیز کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا
ہے کہ خیالات اور ثقافتی موثرات کی منتقلی کا عمل ہمیشہ باہمی داد و ستد کے اصول پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔
فطرتِ انسانی میں یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ ایسی قومیں اور تہذیبیں جو معاشی اور سیاسی اعتبار سے زیادہ
طاقتور ہوتی ہیں وہ اپنے سے کمزور اور سست گام قوموں کو اپنی جانب بڑی شدت کیساتھ مائل کر
لیتی ہیں اور ان کے ذہن و معاشرہ پر اپنے اثرات مرتسم کرنے لگتی ہیں، درآنحالیکہ خود ان کا ذرا سا
بھی اثر قبول نہیں کرتیں۔ جہاں تک آج کی مغربی اور اسلامی دنیاؤں کے باہمی روابط و تعلقات کا معاملہ
ہے اسکی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

آج اسلامی دنیا پر مغربی ثقافت جو یک طرفہ قسم کا زبردست اثر ڈال رہی ہے، وہ ایک
تاریخی مبصر کے نقطۂ نظر سے قطعاً کوئی اعجوبہ نہیں ہے، کیونکہ یہ تو ایک طویل تاریخی عمل (HISTORIC
PROCESS) کا نتیجہ ہے جسکی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ اس توجیہہ سے تو مورخوں کی تسلی ہو جاتی ہے لیکن
ہم جیسے لوگوں کے لئے مسئلہ لاینحل ہی رہ جاتا ہے۔ ہم لوگوں کے لئے جو اس ڈرامہ کے محض شوقین
تماشائی نہیں بلکہ اس کے حقیقی اور عملی کردار ہیں، ہم لوگوں کے لئے جو اپنے تئیں محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے متبعین گردانتے ہیں۔ مسئلہ کی ابتداء سچ پوچھو تو یہیں سے ہوتی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے
کہ اسلام دیگر مذاہب کے برخلاف نہ صرف ذہن کا ایک روحانی رویہ (Spiritual Attitude) ہے
جو مختلف نظاموں کے ساتھ توافق پذیر ہے بلکہ ثقافت کی ایک خود مکتفی اقلیم بھی ہے اور معاشرت
کا ایک واضح اور معروف نظام بھی۔ جب ایک اجنبی ثقافت، جیسا کہ آج کی صورت حال ہے، اپنی
شعاعیں ہم پر بکھیر رہی ہو اور ہمارے ثقافتی نظام میں کچھ تبدیلیاں پیدا کرنے کی بھی موجب بن رہی ہو تو
اس وقت ہم پر یہ معلوم کرنا فرض ہو جاتا ہے، کہ آیا اس اجنبی تاثر کا دھارا خود ہمارے ثقافتی ممکنات

(essential possibilities) کی موافق سمت بہہ رہا ہے یا مخالف سمت میں آیا یہ تاثر اسلامی ثقافت کے جسد میں تریاق کا عمل کر رہا ہے یا کوئی سمومیت پھیلا رہا ہے۔؟

اس سوال کا جواب صرف تحلیل و تجزیہ ہی کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس غرض کے لئے ہمیں چاہیئے کہ اسلامی اور مغرب جدید دونوں ثقافتوں کی محرک قوتوں کا پتہ لگائیں۔ پھر اس امر کی تحقیق کریں کہ ان دونوں کے مابین تعاون عمل کس حد تک ممکن ہے۔ چونکہ اسلامی ثقافت اپنی اصل کے اعتبار سے ایک مذہبی ثقافت ہے، اس لئے ہمیں چاہیئے کہ سب سے پہلے حیات انسانی کی اقلیم میں مذہب کے عام حدود عمل متعین کرنے کی کوشش کریں۔

جس چیز کو ہم "مذہبی رویہ" (Religious attitude) سے تعبیر کرتے ہیں، وہ انسان کی اور حیاتیاتی ساخت کا قدرتی ماحصل ہے۔ زندگی کے رمز، ولادت و موت کے رمز اور ازل و ابد کے رمز کی خود ہی تشریح و توجیہہ کرنا تو انسان کی قدرت سے باہر ہے، کیونکہ اس کے سمند عقل کی رفتار ناقابل عبور دیواروں کے پاس ختم ہو جاتی ہے، لہذا اس کے لئے صرف دو ہی امکانات رہ جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ زندگی کو ایک کلیت (Totality) کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش ترک کر دے۔ اس صورت میں وہ صرف خارجی تجربات کی شہادت ہی پر تکیہ کرے گا اور اپنے نتائج علمیہ کو تجربات کی وسعتوں تک محدود کرے گا۔ اسطرح وہ زندگی کے منفرد جزئیات کے درک کے قابل ہو جائے گا جن کی تعداد و وضاحت اسی تیز و سست رفتار سے بڑھتی اور پھیلتی جاتی ہے جس رفتار سے خود انسان کے علم فطرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، تاہم جزئیات ہمیشہ جزئیات ہی رہیں گے۔ رہ گیا ادراک کلیت کا معاملہ عقل انسانی اپنے منہاجیاتی وسائل (Methodical Equipment) کے باوجود اسکی گرد تک نہ پاسکے گی۔ علوم فطرت کا قافلہ اسی نہج سے رواں ہے، دوسرا امکان جو سابق امکان کے ساتھ ساتھ وجود پذیر رہتا ہے وہ ہے مذہبی طریق۔ مذہب انسان کو ایک باطنی بیشتر وجدانی تجربہ کی وساطت سے زندگی کی وحدانی تعبیر و تشریح (Unitary explanation) قبول کرنے پر مائل کر لیتا ہے۔ اس کا یہ عمل بالعموم اس تصویر پر مبنی ہوتا ہے کہ ایک خالق مطلق کی ہستی موجود ہے جو کائنات پر ایسے سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق حکمران ہے جس کا احاطہ کرنا فہم انسانی کی استعداد سے بعید ہے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ یہ تصور انسان کو زندگی کے ان حقائق و جزئیات کی تحقیق و تفحص سے بھی باز رکھے جو خارجی مشاہدہ کے لئے خود بخود سامنے آجایا کرتے ہیں، کیونکہ خارجی (سائینسی) اور داخلی (مذہبی) ادراک کے مابین کوئی خلقی بیر نہیں ہے۔ مذہبی طریق ہی فی الحقیقت وہ واحد ظنی امکان

(Speculative possibility) ہے جسکی بدولت پوری زندگی کو جوہر اور قوت محرکہ کا اتحاد یا مختصر الفاظ میں ایک عمدہ متوازن و ہم آہنگ کلیت (Totality) سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہم آہنگ کی اصطلاح کا استعمال یہاں بہت ہی بے محل ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ اصطلاح بڑی اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ یہ خود انسان کے باطن میں ایک متقابل رویّہ (Corresponding Attitude) کی موجودگی پر دلالت کرتی ہے۔ مذہبی آدمی یہ جانتا ہے کہ انسان کو اس کے خارج میں جو کچھ پیش آتا ہے اور اس کے باطن میں جو کچھ گذرتا ہے، وہ قوتوں کی اندھا دھند کارفرمائی کا نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتا جس میں شعور و ارادہ کا کوئی دخل ہی نہ ہو، وہ تو یہ یقین رکھتا ہے کہ یہ سب کچھ محض خدائے علیم و خبیر کی مشیت کا اقتضاء ہے۔ لہٰذا یہ خلقی طور پر قدرت کے نظامِ تقدیر سے مربوط ہے۔ اسطرح انسان اس شدید اختلاف کو نمٹانے کے قابل ہو جاتا ہے، جو نفسِ انسانی اور حقائق و ظواہر کی اس دنیا ئے معروض کے مابین پایا جاتا ہے جسے عرفِ عام میں فطرت کہتے ہیں۔ انسان اپنی روح کی تمام تر پیچیدہ میکانیت، اپنی تمام تر خواہشات و خدشات اور اپنے تمام تر احساسات و مجہول شبہات کیساتھ اپنے تئیں ایک ایسی فطرت کے مقابل پایا جاتا ہے جس میں فیضِ وجود اور خوف و سکون ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ بیان انداز میں باہم مخلوط ہیں اور بظاہر ایسے خطوط پہ عمل پیرا ہیں، جو ذہنِ انسانی کی ساخت و اسالیب سے قطعاً مختلف ہیں۔ اس تخالف کو نمٹانے میں خالص عقلی فلسفہ (Intellectual Philosophy) یا تجرباتی سائنس (Experimental Science) آج تک کامیاب نہ ہو سکی، ٹھیک یہی وہ مرحلہ ہے، جہاں مذہب اپنا قدم دھرتا ہے۔

مذہبی ادراک اور تجربہ کی روشنی میں انسان کے نفس خود آگاہ اور گنگ و بے پرواہ فطرت کے مابین ایک روحانی ہم آہنگی کا رشتہ قائم کر دیا جاتا ہے، کیونکہ انسان کا انفرادی شعور اور فطرت، جو انسان کے خارج کو بھی محیط ہے اور باطن کو بھی، دونوں ایک ہی مشیت خلّاق (Creative will) کے گو مختلف مگر ہم ربط مظاہر (Coordinate manifestations) کے سوا کچھ نہیں، اسطرح مذہب انسان کو جس بے پایاں افاضہ سے بہرہ مند کرتا ہے وہ یہ تصوّر ہے کہ اسکی ذات تخلیق کے سلسلۂ ابدی کی ایک عمدہ کڑی اور تقدیر کائنات کے لامتناہی نظام کا ایک متمیز و قطعی جزو ہے۔ اس تصور کا نفسیاتی ماحصل روحانی تحفظ کا عمیق احساس ہے ــــــ بیم و رجا کا وہ باہمی توازن جو ایک مذہبی کو، خواہ اسکا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو، ایک لامذہبی سے متمیز کرتا ہے۔

یہ بنیادی موقف دنیا کے تمام عظیم مذاہب میں مشترک ہے خواہ ان کے مخصوص عقائد کچھ

ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک اور چیز جو ان مذاہب میں اتنی ہی مشترک ہے، وہ انسان سے ان کی یہ اخلاقی اپیل ہے کہ وہ خدا کی مشیت بیّنہ (Manifest will) کے آگے اپنا سر اطاعت خم کر دے لیکن اسلام اور صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو اس نظریاتی توضیح و موعظت کی سرحدوں سے پار گذر جاتا ہے۔ یہ مذہب نہ صرف یہ تعلیم دیتا ہے کہ ساری زندگی فی الاصل ایک وحدت (Unity) ہے ـــــ اس لئے کہ یہ توحید باری سے رواں ہوتی ہے۔ بلکہ اپنے ہر پیرو کو اپنی انفرادی دنیاوی زندگی کے حدود میں اور وجود و شعور کے دائروں کے اندر اتحاد خیال و عمل کا مظاہرہ کرنے کا عملی طریقہ بھی سکھاتا ہے۔ زندگی کے اس بلند ترین مقصد کے حصول کے لئے اسلام کسی شخص کو ترک دنیا پر مجبور نہیں کرتا۔ اس مذہب میں نہ تو تزکیۂ روح کے لئے کسی قسم کے شدائد و مصائب جھیلنے کی ضرورت پڑتی ہے، اور نہ حصولِ نجات کے لئے ذہنوں پر ناقابلِ فہم عقائد مسلّط کئے جاتے ہیں۔ اس قبیل کی تمام چیزوں سے اسلام کا قطعاً کوئی علاقہ نہیں۔ کیونکہ یہ مذہب نہ تو کوئی صوفیانہ عقیدہ ہے اور نہ کوئی فلسفہ۔ یہ تو ایک نظامِ حیات ہے، قوانینِ فطرت کے عین مطابق جسے خالق نے اپنی مخلوق کے لئے پسند اور مامور فرمایا ہے۔ اس نظام کی اعلیٰ ترین کامیابی حیاتِ انسانی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کی مطابقت و ارتباط ہے۔ اسلامی تعلیمات میں انسان کے مادی اور اخلاقی وجود کے بنیادی اختلاف کو یکسر مٹانے کی غرض سے زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو نہ صرف "متوافق" ہی نہیں بنایا جاتا ہے بلکہ یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کی ہم موجودیت (Co existence) اور عدم انفکاکیت ہی زندگی کی قدرتی اساس ہے۔

ہماری دانست میں اسلام کے مخصوص طریقۂ صلوٰۃ کی توجیہہ جس میں روحانی ارتکاز اور چند جسمانی حرکات باہمدیگر مربوط کئے جاتے ہیں، یہی ہو سکتی ہے۔ اسلام کے بعض کینہ پرور نقاد اکثر اسی طریقۂ عبادت کو اپنے اس الزام کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں کہ اسلام ایک رواجیت پسند اور ظاہر داری کا مذہب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غیر مذاہب کے لوگ جو "جسمانی" سے "روحانی" کو اس انداز سے جدا کرنے کے خوگر ہیں جس انداز سے ایک گوالا دودھ سے مکھن جدا کرتا ہے، ان کی سمجھ میں یہ بات ہرگز آسانی سے نہیں آ سکتی کہ اسلام کے شیرِ خالص میں یہ دونوں عناصر اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود کمال ہم آہنگی سے وجود پذیر ہیں اور اپنے تئیں ایک ساتھ ظاہر کرتے ہیں، دوسرے لفظوں میں اسلامی صلوٰۃ ذہنی ارتکاز اور جسمانی حرکات پر مشتمل ہے۔ اسکی وجہ ایک تو یہ ہے کہ خود حیاتِ انسانی کی ساخت ایسی ہی کچھ ہے اور دوسری یہ کہ ہم پر یہ واجب ہوتا

ہے کہ ہم اپنے رب کی بارگاہ میں اسطرح حاضر ہوں کہ ہماری عبائے عبودیت پر ان تمام اوصاف و ملکات کے رنگ نمایاں ہوں جو اس نے ہمیں ودیعت کئے ہیں۔

فکر و عمل کے اس انداز کی مزید مثال آپ کو رسم طواف کعبہ میں ملے گی۔ چونکہ مکہ معظمہ میں داخل ہونے والے ہر شخص پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ وہ کعبہ بیت اللہ کا سات بار طواف کرے اور چونکہ اس فریضہ کی بجا آوری حج بیت اللہ کے مناسک میں سے ایک ہے، اس لئے ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنے کا حق حاصل ہے کہ آخر اس کا کیا مطلب ہے۔؟ کیا عبادت کا ایسے رسمی طریقہ کی صورت میں اظہار کیا جانا ضروری ہے۔؟

جواب بالکل واضح ہے۔ اگر ہم کسی شے کے گرد ایک دائرہ کی شکل میں گھومیں تو ہم اس شے کو اپنے عمل کا گویا مرکز قرار دے لیتے ہیں۔ کعبہ بیت اللہ جس کی طرف ہر مسلمان نماز میں اپنا رخ کرتا ہے، توحید باری کی علامت کو ظاہر کرتا ہے۔ طواف میں حاجیوں کی جسمانی نقل و حرکت حیات انسانی کی فعلیت کی علامت کو ظاہر کرتی ہے۔ لہذا طواف کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے تصوّر اور اسکی توحید کو نہ صرف ہمارے ذہنی افکار ہی کا مرکز ہونا چاہئے بلکہ ہماری ساری زندگی اور ہمارے تمام اعمال و مساعی کا مرکز بھی ۔۔۔ قرآن پاک کے اس ارشاد کے مطابق کہ :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا

إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ (سورہ ۵۱: ۵۶) ہے کہ میری عبادت کریں۔

پس اسلام کا تصوّرِ عبادت دیگر تمام مذاہب کے تصورِ عبادت سے قطعاً مختلف ہے اسلام میں یہ تصور خالص عباداتی اعمال مثلاً نماز یا روزہ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی ساری عملی زندگی کو محیط ہے۔ اگر ہماری کل زندگی کا مدعا خدا کی عبادت ہے تو ہم پر لازم ہے کہ اس زندگی کے تمام پہلوؤں کی مجموعیت (Totality) کو ایک کثیر پہلو اخلاقی ذمہ داری (Complex Responsibility) سمجھیں۔ بریں بنار ہمارے تمام اعمال حتیٰ کہ وہ بھی جو بظاہر نہایت معمولی سے نظر آتے ہیں، عبادات ہی کی طرح انجام دئے جانے چاہئیں۔ یعنی اس شعور کے ساتھ انجام دئے جانے چاہئیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے نظامِ کائنات کے جزو ہیں۔ ہر چند کہ یہ بات ایک عامی کے لئے تصور بعید کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن کیا تصورات کو واقعیت کا قالب عطا کرنا مذہب کا مدعا نہیں ہے۔؟

اس بارہ میں اسلام کا جو موقف ہے اس میں کسی مغالطہ کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ اسلام کی سب سے پہلی تعلیم یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے تمام گوناگوں اعمال میں خدا کی عبادت مستترہ ہی اس زندگی کا

اصل مدعا ہے ، دوسری یہ کہ جب تک ہم زندگی کو روحانی اور مادی دو خانوں میں تقسیم کرتے رہیں گے اس وقت تک اس مدعا کا حاصل ہونا ممکن نہیں ۔ لہذا لازم ہے کہ ہمارے شعور وعمل میں زندگی کے یہ دونوں پہلو ایک ہم آہنگ ذات (Harmonius entity) میں متحد و مربوط کر دئے جائیں اور یہ بھی لازم ہے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو باہم متحد و مربوط کرنے کی جو جدوجہد ہم کرتے ہیں ، اس میں ہمارا تصوّر توحید باری ہمیشہ منعکس ہوتا رہے ۔

یہ اندازِ فکر منطقی اعتبار سے اسلام اور دیگر مذاہب کے مابین ایک فرق مزید پر منتج ہوتا ہے ۔ یہ فرق آپ اس حقیقت پائیں گے کہ اسلام تعلیم عقائد کی حیثیت سے نہ صرف انسان اور اس کے خالق کے باہمی مابعد الطبعی تعلقات (Metaphysical Relations) ہی کے تعیّن کی ذمہ داری لیتا ہے بلکہ بلا کم وکاست فرد اور اس کے سماجی ماحول کے مابین دنیاوی تعلقات کے تعیّن کی بھی ۔ اسلام میں حیات دنیاوی محض ایک خالی خولی خول یا عالم آخرت کا بے معنی پرتو نہیں بلکہ ایک مکمل ایجابی وجود سمجھی جاتی ہے ۔ خود باری تعالیٰ ایک وحدت ہے نہ صرف فی الذات بلکہ فی المقصد بھی ۔ لہذا اسکی مخلوق بھی ایک وحدت ہے ۔ فی الذات امکاناً اور فی المقصد یقیناً ۔

اسلام کی رو سے مدعائے حیات عبارت ہے ۔ عبادتِ الٰہی سے ان وسیع معنوں میں جنکی سطور بالا میں صراحت کی گئی ہے ۔ اور صرف یہی وہ تصوّر ہے جو ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ انسان اپنی انفرادی حیات دنیاوی کے دائرہ کے اندر کاملیت (Perfection) سے شاد کام ہو سکتا ہے ۔ دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو یہ اعلان کرتا ہے کہ ہماری اس دنیائے آب وگل میں فرد کا کاملیت (Perfection) سے بہرہ ور ہونا ممکن ہے ، اس مقصد کی بجا آوری کو اسلام نام نہاد "جسمانی" خواہشات کے مغلوب ہونے تک ملتوی نہیں رکھتا جیسا کہ مسیحیت کا طریقہ ہے ، نہ اسلام انسان کے بلند سے بلند تر مراتب پر علی الاتصال جنم لینے کا یقین دلاتا ہے جیسا کہ ہندومت کا معاملہ ہے ۔ اور نہ اسلام بدھ مت سے اس امر پر اتفاق کرتا ہے کہ کاملیت ونجات ــــ (Perfection and Salvation) کا حصول صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جبکہ فرد اپنی ہستی کو فنا اور دنیا کے ساتھ اپنے جذباتی علائق کو معدوم کر دے ۔ نہیں ! ــــ اسلام تو پورے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان اپنی دنیاوی انفرادی زندگی ہی میں اور زندگی کے تمام دنیاوی ممکنات سے بھرپور طریقہ سے متمتع ہوتے ہوئے کاملیت (Perfection) سے ہمکنار ہو سکتا ہے ۔

ــــ (باقی آئندہ) ــــ

جناب مضطر عباسی صاحب ایم۔ اے (مری)

اسراف کا معاشی پہلو

دولت کا بے جا صرف اسراف کہلاتا ہے، اسراف کی حقیقت کے بیان کے لئے صرفِ دولت کی حقیقت کا بیان ضروری ہے۔ اس لئے کہ اسراف جزو ہے اور صرفِ دولت کل۔ اس جزو کی حقیقت اور اصلیت تب ہی واضح اور نمایاں ہو سکتی ہے، جب اسے اس کے کل میں اس جگہ رکھ کر دیکھا جائے جو اس کا اصل مقام ہے، لہذا ہم "صرفِ دولت" کے بیان سے گفتگو شروع کرتے ہیں۔

صرفِ دولت | علم معاشیات کے چار اہم اور بنیادی مسائل میں سب سے پہلا مسئلہ "صرفِ دولت" کا ہے۔ باقی تین مسائل یعنی پیدائشِ دولت، تقسیمِ دولت، اور تبادلۂ دولت اسکے بعد زیرِ بحث آتے ہیں، گو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیدائشِ دولت کا مقام پہلا ہے، لیکن علم معاشیات کے علماء نے اسے ہمیشہ دوسری حیثیت دی ہے۔ اور سب سے پہلے صرفِ دولت کا مقام رکھا ہے۔ اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ صرفِ دولت میں ان حاجتوں سے بحث کی جاتی ہے جن کے پورا کرنے کیلئے دولت پیدا کی جاتی ہے۔ صرفِ دولت کے بیان کیلئے انسان کی معاشی حاجتوں کا بیان ضروری ہے۔

معاشی حاجتیں | معاشی حاجتوں سے مراد وہ حاجتیں ہیں جنہیں معاشی اشیاء یعنی دولت کے ذریعہ پورا کیا جا سکتا ہے، ان حاجتوں کی تین قسمیں ہیں:-

۱۔ ضروریات —— یعنی وہ معاشی حاجتیں جن کا پورا کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے، ان حاجتوں کو پورا نہ کیا جائے تو انسانی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ جیسے کھانے، پینے، رہنے اور علاج وغیرہ قسم کی حاجتیں ہیں، انہیں بنیادی حاجتیں بھی کہا جاتا ہے۔ انجمن اقوامِ متحدہ کے ایک ادارے نے انسان کی بنیادی حاجتوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔

۲۔ آسائشات | یہ دوسرے درجے کی حاجتیں ہیں ان کا پورا کیا جانا ضروری نہیں ہوتا، البتہ اگر انہیں پورا کر لیا جائے تو زندگی میں سہولت اور آسانی پیدا ہو سکتی ہے، جیسے کھانے کے ساتھ شیرینی رہائشی مکان کے ساتھ دوست احباب کے ٹھہرانے کیلئے بیٹھک اور ایک سے زائد لباس وغیرہ

۳۔ تعیشات | یہ تیسرے درجے کی فرضی حاجتیں ہیں، اسلام انہیں حاجتوں کے کسی درجے میں بھی شمار نہیں کرتا، البتہ دنیا کے موجودہ معاشی نظاموں میں انہیں بھی حاجتوں ہی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایسی حاجتیں ہیں کہ ان کے پورا کرنے پر نقصان زیادہ اور نفع کم ہوتا ہے۔ جیسے کھانے کے ساتھ شراب و کباب اور رہائشی مکان کے ساتھ وسیع احاطے، سیر و تفریح کیلئے کاروں، نوکروں اور کتوں کی فوجیں وغیرہ۔

حاجتوں کی اضافی حیثیت | اس موقع پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ حاجتوں کی حیثیت مطلق نہیں بلکہ اضافی ہوتی ہے، ایک چیز ایک شخص کے لئے اسکی ضروریات میں شمار ہوتی ہے اور وہی چیز کسی دوسرے کے لئے آسائشات یا تعیشات میں شمار ہو سکتی ہے۔ ایک اچھا قلم مضمون نویس کیلئے ضروری ہے اور جو شخص کبھی کبھار ایک آدھ جملہ لکھتا ہے اس کیلئے اچھا قیمتی قلم ضروری نہیں، وہ معمولی قلم سے بھی کام چلا سکتا ہے اور ایک ان پڑھ کیلئے قلم قطعاً غیر ضروری اور تعیشات میں داخل ہے۔ ایک معمولی دوکاندار کیلئے کار ضروری نہیں لیکن ایک وزیر یا ڈاکٹر کیلئے جسے وقتاً فوقتاً دور دراز مقامات تک جانا ہوتا ہے کار ضروری ہے۔

افادہ | دولت کی ہر اکائی میں ایک خاص صلاحیت یا قوت ہوتی ہے جسے افادہ یا قدرِ استعمال کہتے ہیں، یہی وہ صلاحیت یا قوت ہے جو انسانی حاجت پورا کرتی ہے، اگر دولت کی کسی اکائی میں افادہ کی صلاحیت نہ رہے تو وہ اکائی مادے کا ڈھیر تو ہو سکتی ہے اسے دولت نہیں کہا جا سکتا مزدور اور محنت کش لوگ محنت کر کے مادے میں افادہ پیدا کرتے ہیں اور صارف مادے میں پائے جانے والے اس جوہر یعنی افادہ سے مستفید ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ نہ کوئی محنت کش مادہ پیدا کرتا ہے اور نہ کوئی صارف مادہ خرچ کرتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ محنت کش مادے کی حالت بدل کر اس میں افادہ پیدا کرتا ہے اور صارف افادہ خرچ کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ دولت پیدا نہیں ہوتی بلکہ افادہ پیدا ہوتا ہے۔ نیز دولت صرف نہیں ہوتی بلکہ افادہ صرف ہوتا ہے۔

قانونِ تقلیلِ افادہ | علم معاشیات کے علماء نے صرفِ دولت کا گہرا مطالعہ کر کے ایک ہمہ گیر قانون کا انکشاف کیا ہے، اور اس کا نام رکھا ہے "قانونِ تقلیلِ افادہ" یہ قانون صرفِ دولت کے

ہر عمل میں جاری رہتا ہے۔ یہ قانون طبعیات کے عام قوانین کی طرح اٹل اور غیر متبدل ہے، اور اسکی عمل پذیری کے اثرات و نتائج سے صرف دولت کا کوئی گوشہ اور پہلو بچ نہیں سکتا۔ اس قانون کا مفہوم یہ ہے:

دولت کی برابر مقداریں (اکائیاں) مسلسل استعمال کی جائیں تو ہر بعد میں استعمال ہونے والی مقدار سے جو افادہ حاصل ہوگا وہ پہلے استعمال ہونے والی مقدار سے حاصل ہونے والے افادہ کی نسبت کم ہوگا تاآنکہ ایک حد پر افادہ صفر رہ جائے گا اور اس کے بعد دولت کی مزید اکائیاں صرف کرنے سے عدم افادہ یعنی نقصان ہونے لگے گا۔

آئیے اسکی وضاحت کیلئے ذیل کی مثال پر غور کریں۔ ایک شخص پیاس کی شدت کے باعث قریب المرگ ہے، اسے ایک گلاس پانی مل جاتا ہے، جسے پی کر یہ شخص اپنی جان بچا لیتا ہے۔ اس کے بعد اسے ایک گلاس مزید دیا جاتا ہے یہ اسے بھی پی لیتا ہے، لیکن اس کے پینے سے اسے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا جو پہلے گلاس کے پینے سے حاصل ہوا ہے۔ پہلے گلاس نے اس کو موت سے بچایا ہے اور دوسرے نے محض پیاس بجھانے کا کام کیا ہے، اب اسے تیسرا گلاس دیا جاتا ہے، تو عام حالات میں یہ نہیں پیئے گا، اور ممکن ہے کہ پی بھی لے، لیکن چوتھا گلاس تو بہر حال نہیں پیئے گا، پہلے گلاس کیلئے یہ شخص خاصی قیمت دینے کیلئے بھی تیار ہو سکتا تھا لیکن تیسرے یا چوتھے گلاس کیلئے قیمت تو در کنار مفت بھی نہیں پینا چاہتا۔ غور فرمائیں کہ پانچوں گلاس میں ایک جیسا پانی ہے لیکن پہلا گلاس شخص مذکور کے لئے زیادہ مفید دوسرا کم تیسرا غیر مفید اور چوتھا بجائے مفید ہونے کے مضر ہے۔ یہ اس لئے کہ "تقلیل افادہ" کے قانون کے مطابق پانی کی برابر مقداروں کے مسلسل استعمال سے ہر بعد میں استعمال ہونے والے گلاس کے پانی کا افادہ کم ہوتا رہا، تیسرے گلاس کے پانی کا افادہ صفر رہ گیا اور اس کے بعد چوتھے گلاس کا افادہ منفی یعنی نقصان بن گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ دولت کی برابر اکائیوں میں افادہ کی مقدار برابر ہے لیکن مسلسل استعمال کرنے سے صارف کی ضرورت یعنی اشتہاء اور خواہش کم ہو جاتی ہے اس لئے اس مخصوص صارف کے لئے افادہ کم ہو جاتا ہے۔ مذکورہ مثال میں پانچواں گلاس شخص مذکور کے لئے مضر تھا، لیکن یہی گلاس کسی تشنہ لب قریب المرگ شخص کے لئے مایہ حیات ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ:

دولت کی مختلف مقداروں میں افادہ صارف کی ضرورت اشتہا اور خواہش کے مطابق کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے۔

بالفاظ دیگر محنت کش مادے میں افادہ پیدا کرتا ہے اور افادے سے مادہ دولت بن جاتا ہے اب اگر دولت ایسے آدمی کے پاس چلی جائے جس کے پاس پہلے سے کافی دولت موجود ہے تو اس کے لئے اس میں افادہ نہ رہے گا، گویا محنت کش کی محنت رائیگاں گئی، کسان نے رات دن محنت کر کے زمین کے اجزا کو سنہرے خوشوں کا روپ دیکر غلہ پیدا کیا، دولت پیدا کی، یہ غلہ ایک غریب مفلس اور نادار خاندان کے ہاتھ لگ گیا تو مایۂ حیات بن گیا، کسان کی محنت ٹھکانے لگی، غریب خاندان کے افراد نے پیٹ بھر کر نہ صرف کسان کیلئے دعا کی بلکہ محنت و مشقت کر کے ملک کی دولت میں اضافہ کیا جس سے کسان بھی مستفید ہوا، اور اگر یہ غلہ کسی بڑے زمیندار یا جاگیردار کے گودام میں چلا گیا اور گل سڑ کر تعفن کا باعث بن گیا مالک کی طبیعت الگ خراب ہوئی اور نوکروں ملازموں کو اس گلے سڑے غلے کو دریا برد کرنے کیلئے الگ مشقت سے کام لینا پڑا۔

معاشی بحران انیسویں صدی معاشی بحرانوں کیلئے خاص طور پر مشہور ہے۔ اس صدی میں یورپ اور امریکہ میں کئی بار ایسا ہوا ہے کہ غریب محنت کشوں نے بے پناہ دولت پیدا کر ڈالی، یہ دولت حاجت مندوں تک نہ پہنچ سکی اور جن کے پاس پہلے ہی کافی دولت تھی وہ اس کے بھی مالک بن گئے، چونکہ ان کے پاس پہلے سے دولت موجود تھی اس لئے قانونِ تقلیل افادہ کے مطابق مزید دولت ان کیلئے مفید نہ تھی اور انہوں نے لاکھوں روپے خرچ کر کے اس دولت کو سمندروں میں پھینکوا دیا۔

غرض دولت کا افادہ صارف کی اشتہا کے مطابق کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے اور دولت کی جس قدر زیادہ مقدار حاصل ہوگی اسی قدر صاحب دولت کی خواہش اور اشتہا میں کمی آجائے گی۔ اس لئے اس کا افادہ کم ہو جائے گا۔ امید ہے ان معروضات سے قانونِ تقلیل افادہ کی حقیقت واضح ہو گئی ہوگی، اب آیئے قانونِ صرفِ دولت کی طرف:

قانونِ صرفِ دولت دولت سے زیادہ سے زیادہ افادہ حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ قانونِ صرفِ دولت کی پابندی کی جائے اس کا مفہوم یہ ہے کہ دولت کو اس انداز سے خرچ کیا جائے کہ اسکی زیادہ سے زیادہ مقدار ضروریات پر صرف ہو ایسا کرنے سے دولت کا مجموعی طور پر افادہ زیادہ ہوتا ہے۔

فرض کریں ایک خاندان کے تین افراد ہیں اور ہر فرد کی تین حاجتیں، ایک ضروریات سے تعلق رکھتی ہے، دوسری آسائشات سے اور تیسری تعیشات سے۔ صاحب خاندان کے پاس دولت کی تین اکائیاں ہیں، اگر یہ تین اکائیاں تینوں افراد پر برابر تقسیم کر دی جائیں تو ہر فرد اپنے حصے کی دولت اپنی

پہلی حاجت یعنی ضرورت پر صرف کریگا، ضرورت پر خرچ ہونے والی دولت کی اکائی کا افادہ ۱۰۰ ہوتا ہے، آسائش پر خرچ کی جانے والی دولت کی اکائی کا افادہ ۵۰ اور تعیش پر صرف ہونے والی دولت کی اکائی کا افادہ ۲۵ ہوتا ہے۔ اب اگر دولت کی تینوں اکائیاں تینوں افراد کو دی جائیں تو یہ تینوں اپنی اپنی ضروریات پر صرف کریں گے اور اسطرح تینوں اکائیوں سے صرف تین افراد کو جو افادہ حاصل ہوگا وہ ۳۰۰ ہوگا اور اگر ایک کو دو اکائیاں دی جائیں تو یہ شخص پہلی اکائی تو ضرورت پر صرف کرکے ۱۰۰ افادہ حاصل کرے گا، اور دوسری آسائش پر صرف کرکے ۵۰ افادہ حاصل کرے گا، اس طرح ایک شخص افادہ کی ۱۰۰ اکائیوں سے محروم رہ جائے گا، اور دوسرے دو بجائے تین سو کے افادے کی ۱۵۰ اکائیاں حاصل کریں گے اور اگر یہ دولت کی تینوں اکائیاں ایک ہی فرد کے حوالے کر دی جائیں تو یہ شخص پہلی اکائی ضرورت پر صرف کرکے ۱۰۰ درجے افادہ حاصل کرے گا، دوسری اکائی آسائش پر صرف کرکے ۵۰ درجے اور تیسری اکائی تعیش پر صرف کرکے ۲۵ درجے افادہ حاصل کرے گا، گویا اسے ۱۷۵ درجے افادہ حاصل ہوگا اور دوسرے دو شخصوں کا نقصان دو سو درجے ہوگا، گویا جس دولت سے ۳۰۰ درجے افادہ کا وصول ممکن تھا اس سے صرف ۱۷۵ درجے افادہ حاصل کیا گیا ہے۔

صرفِ دولت کا قانون یہ ہے کہ اگر دولت ضرورت پر صرف کی جائے تو اس سے زیادہ افادہ حاصل ہوتا ہے اور اگر آسائش پر صرف کی جائے تو کم اور اگر تعیش پر صرف کی جائے تو اس سے بہت ہی کم افادہ حاصل ہوتا ہے۔

دولت کی تقسیم میں جس قدر مساوات زیادہ ہوگی اسی قدر دولت کی زیادہ مقدار ضروریات پر خرچ ہوگی اور جس قدر عدم مساوات کی صورت ہوگی اسی قدر دولت کی زیادہ مقدار آسائشات اور تعیشات پر صرف ہوگی۔ نیز ضروریات پر صرف ہونے والی دولت کا افادہ زیادہ ہوتا ہے اور آسائشات اور تعیشات پر صرف ہونے والی دولت کا افادہ کم ہوتا ہے، لہذا دولت سے زیادہ سے زیادہ افادہ حاصل کرنے کا قانون یہ ہے کہ دولت کی زیادہ سے زیادہ مقدار ضروریات پر خرچ کی جائے اور یہ اسطرح ممکن ہے کہ دولت کی تقسیم میں مساوات کے اصول پر زیادہ سے زیادہ عمل کیا جائے۔

اسراف صرفِ دولت کے متعلق مذکورہ بحث کے بعد اسراف کی حقیقت خود بخود نمایاں ہو جاتی ہے، یعنی اسراف یہ ہے کہ دولت کو اس طریق پر اور اس انداز سے خرچ کیا جائے کہ

اس سے کم افادہ حاصل ہو جبکہ زیادہ افادہ حاصل کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

کوئی شخص خواہ کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو اپنے قبضے میں آئی دولت کو بے مقصد ضائع نہیں کرتا جو کچھ کرتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اسکی دولت کی زیادہ مقدار آسائشات اور تعیشات پر صرف ہوتی ہے، اور اسی کا نام اسراف ہے، ضروریات پر صرف کی جانے والی دولت تو بہرحال اپنے جائز بلکہ ضروری مصرف پر صرف ہوتی ہے اور اس سے پورا پورا افادہ حاصل کیا جاتا ہے۔ رہی آسائشات سو اگر فرد کی ضروریات پوری ہو چکی ہیں تو اسے آسائشات پر صرف کی از روئے اسلام اجازت ہے صاحب خانہ آسائشات پر اس وقت دولت صرف کرنے کا مجاز ہے جب اہل خانہ کی تمام ضروریات پوری ہو چکی ہوں اور ارباب مملکت کو آسائشات پر دولت صرف کرنا اس وقت جائز ہو گا جب تمام اہل ملک کی ضروریات پوری ہو چکی ہوں۔ باقی رہیں تعیشات سو ان پر دولت کا خرچ کرنا بہرحال اسراف ہے۔

اس موقع پر یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ جب کسی ملک کے عوام کا معیار زندگی بلند ہو جاتا ہے۔ تو بعض آسائشات ضروریات کے درجے میں اور بعض تعیشات آسائشات کے درجے میں آجاتی ہیں۔ تاہم بعض تعیشات ایسی ہیں جو ملک کے معیار زندگی کے بلند ترین ہو جانے کے باوجود بھی آسائشات کی طرح جواز کی سند حاصل نہیں کر سکتیں، جیسے سونے چاندی کے برتن ہیں۔ ملک کتنا ہی خوشحال ہو جائے لوگوں کا معیار زندگی کتنا ہی بلند اور ارفع ہو جائے ان کا استعمال جائز نہیں ہو سکتا۔

جو تعیشات معیار زندگی کے بلند ترین ہو جانے کے باوجود آسائشات کے درجے میں نہیں آسکتیں یہ وہ ہیں جنہیں معاشرے کی برائیوں کی اصل کہا جاتا ہے، اگر کسی معاشرے میں یہ تعیشات، آسائشات یا ضروریات کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں تو اس معاشرے میں تن آسانی کاہلی اور محنت سے عدم رغبت کے رجحانات پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ نیز اخلاق اور کردار پر برے اثرات پڑنے لگتے ہیں۔

پاکستان کی مثال | پاکستان میں معاشی بدحالی اسی اسراف کی بدولت ہے۔ پاکستان کی کل دولت کا اسی فیصد حصہ چند سرمایہ داروں صنعت کاروں اور جاگیرداروں کے قبضے میں ہے، باقی بیس فیصد دولت ۱۲ کروڑ عوام کے حصے میں آئی ہے، عوام اس قلیل دولت سے اپنی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتے اور مٹھی بھر سرمایہ دار اور ان کے ساتھی ۸۰ فیصد دولت تعیشات پر صرف

کر رہے ہیں، گویا ملک کی ۸۰ فیصد دولت سے پورا پورا افادہ حاصل نہیں کیا جا رہا۔

سرکاری خزانے سے عوام میں تقسیم ہونے والی دولت بھی اسراف کا شکار ہو رہی ہے ایک شخص کو ۶۰ روپیہ ماہوار اور دوسرے کو ۲ ہزار روپے ماہوار تنخواہ مل رہی ہے، پہلے شخص کی ضروریات پوری نہیں ہو رہیں اور دوسرا شخص دو سو روپیہ ضروریات پر صرف کرنے کے بعد کم و بیش ۱۸۰۰ سو روپیہ ماہوار تعیشات پر صرف کر رہا ہے

خیال رہے کہ جن لوگوں کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ دولت ہے وہ دولت چاہے تعیشات پر خرچ ہوتی ہو یا بنکوں میں جمع ہو ہر صورت میں اسراف ہے۔ تعیشات پر صرف کی صورت میں اسراف ظاہر ہے اور جمع کروانے کی صورت میں اسراف یوں ہے کہ اس سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا جسطرح کھیت کاشت نہ کرنا کھیت کی قوت روئیدگی کا اسراف ہے۔ کارخانے کو بند رکھنا مشین اور کاریگر کی صلاحیت اور محنت کا اسراف ہے، اسی طرح روپیہ کو گردش میں نہ رکھنا گردش زر سے حاصل ہونے والے مفادات کا اسراف ہے۔

دولت کا بے جا صرف اسراف ہے یعنی دولت کا بجائے ضروریات کے آسائشات اور تعیشات پر صرف اسراف ہے۔ دولت کا ایسے آدمی کے قبضے میں رہنا جو اپنی ضروریات پوری کر چکا ہے اسراف ہے اور دولت کا ایسے منصوبوں پر صرف کرنا جن سے عوام کی ضروریات کی نہیں بلکہ آسائشات یا تعیشات کی تسکین ہوتی ہے اسراف ہے۔ اسراف جس طرح فرد واحد کی معاشی حالت کو تباہ کر دیتا ہے اسی طرح قوموں کی اجتماعی معاشیات کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔

مادی دولت کے اسراف کے سوا وقت اور قوت نیز ذہنی صلاحیتوں کا اسراف بھی مہلک نتائج پیدا کرتا ہے۔ انسان کو اسکی صلاحیت کے مطابق کام نہ دینا نا اہل کے سپرد ایسے کام کرنا جن کے لئے خاصی اہلیت کی ضرورت ہو نیز لوگوں کو بیکار رکھنا اسراف کی مختلف صورتیں ہیں ــــــ

عالمی اسراف: پاکستان میں دولت کی غیر مساوی تقسیم کے باعث اسراف کی جو صورت حال ہے وہ نمایاں ہے، یعنی ملک کی کل آمدنی کا کم و بیش ۸۰ فیصد آسائشات اور تعیشات پر صرف ہو رہا ہے، لیکن پاکستان دنیا کے دوسرے ممالک کے معاشی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا سوائے اس کے کہ ملک کا معاشی نظام دنیا بھر کے ممالک کے معاشی نظاموں سے مختلف ہو۔ (یعنی اسلام کا معاشی اور اقتصادی نظام رائج ہو۔) اس وقت یہاں سرمایہ دارانہ معاشی

نظام کا چلن ہے اور دنیا کے بڑے سرمایہ دار ممالک کے اچھے برے ہر قسم کے اثرات یہاں کی معاشی حالت پر اثر انداز ہو رہے ہیں، ان حالات میں "عالمی اسراف" پر کچھ کہنا بے جا نہیں ہوگا عالمی سطح پر دولت کا جو اسراف ہو رہا ہے اس سے ہمارے یا کسی دوسرے ترقی پذیر ملک کے اسراف کی حقیقت کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

مشہور برطانوی فلسفی اور سیاست دان "برٹرینڈ رسل" کے کہنے کے مطابق آج دنیا کی ساٹھ فیصد پیداوار کا مالک امریکہ ہے اور یاد رہے کہ امریکہ کی آبادی دنیا کی آبادی کا صرف چھ فیصد ہے گویا دنیا کے چھ فیصد سرمایہ دار پوری دنیا کے ساٹھ فیصد وسائل معاش پر قابض ہیں۔

اس موقع پر اس حقیقت کا ذہن نشین رہنا کہ امریکہ میں بھی سرمایہ دارانہ نظام معاشیات نہایت ضروری ہے، امریکہ کی کل آبادی دنیا کا چھ فیصد ہے، لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں ہو سکتا کہ یہ چھ فیصد امریکی ساری دنیا کے ساٹھ فیصد ذرائع پیداوار اور وسائل معاش پر قابض ہیں بلکہ خود امریکہ میں سرمایہ دارانہ نظام کی بدولت وہاں بھی اکثریت ناداروں، محنت کشوں اور کاشتکاروں کی اگر امریکہ میں پاکستان ہی کی نسبت سے ۸۰ فیصد دولت کے مالک دو یا تین فیصد سرمایہ دار ہوں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ دنیا کی ساٹھ فیصد دولت پر امریکہ کے دو فیصد یعنی دنیا کے عشار ایک فیصد سے بھی کم سرمایہ دار قابض ہیں۔ بالفاظ دیگر دنیا کی کل دولت کا ساٹھ فیصد سے کہیں زیادہ حصہ آسائشات اور تعیشات پر صرف ہو کر اسراف کا شکار ہو رہا ہے۔

امریکی اسراف کی بدترین مثالیں | یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ساٹھ فیصد عوام بلکہ اس سے بھی زیادہ بنیادی ضروریات کی چیزوں سے بھی محروم ہیں۔ اور امریکہ کے سرمایہ دار ایک کھلونے (اپالو گیارہ) پر پاکستان کے تیس سالوں کے بجٹ کے مساوی دولت خرچ کرتے ہیں اور ویت نام میں بقول ایک امریکی ریاست کے سابق صدر "جان بوش" کے امریکہ نے ایک سال میں اتنا زیادہ گولا بارود خرچ کیا ہے کہ اگر شمالی اور جنوبی پورے ویٹ نام کی سرزمین پر سونے کی نصف انچ موٹی تہہ بچھائی جاتی تو اس پر کم خرچ ہوتا۔

امریکی سرمایہ دار دولت کا اسراف کسطرح کر رہے ہیں۔؟ اس کا اندازہ برٹرینڈ رسل کی حالیہ تصنیف "جنگی جرائم" (WAR CRIMES IN VIETNAM) کے درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

اس سلطنت (امریکہ) کی جارحیت بنی نوع انسان پر ایک لاکھ چالیس ہزار ملین ڈالر

سالانہ یا سولہ ملین ڈالر فی گھنٹہ کا خرچ عائد کرتی ہے، ہتھیاروں پر موجودہ خرچ تمام ترقی پذیر ملکوں کی آمدنی سے زیادہ ہے۔ یہ افریقہ ایشیا اور لاطینی امریکہ کی قومی آمدنی سے زیادہ ہے، امریکہ کا فوجی بجٹ تقریباً ساٹھ ہزار ملین ڈالر سالانہ ہے، ایک اٹلس میزائیل پر ۳ کروڑ ڈالر خرچ آتا ہے جو نائٹروجن کھاد کے کارخانے کے کل خرچ کے برابر ہے، جو ہر سال ستر ہزار ٹن کھاد تیار کرتا ہے۔ ایک خوشحال ملک کی مثال کے طور پر اس بات کو صرف برطانیہ کے سلسلے میں جانچیں ایک متروک الاستعمال میزائیل چار یونیورسٹیوں اور ایک زمین سے فضا کی طرف جانے والا میزائیل ایک لاکھ ٹریکٹروں کے برابر ہوتا ہے۔ (کتاب مذکورہ صـــ۱۱۶)

یہ دولت کا اسراف جنگی میدان میں ہے انسان انسان کو ہلاک کرنے کیلئے جو کچھ کر رہا ہے یہ اسکی ایک جھلک ہے۔ ہو سکتا ہے قارئین میں سے کوئی صاحب خیال کریں کہ جنگ ایک مجبوری ہوتی ہے اور مجبوری کی حالت میں انسان حد سے زیادہ خرچ کر جاتا ہے۔ نیز یہ کہ مجبوری کی حالت میں جو صرف کیا جائے وہ اسراف نہیں ہو سکتا، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے ـــ

پہلی بات یہ کہ امریکہ ویت نام میں جنگ لڑنے پر مجبور نہیں، دوسری بات جس پر جان بوش (JUAN BOSCH) وسطی امریکہ کی ریاست "ڈومنکن" کے سابق صدر نے اپنی تازہ ترین کتاب "پینٹاگونزم" (PENTAGONISM) میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے یہ ہے کہ امریکی سرمایہ دار صرف اور صرف نفع اندوزی کی خاطر ویت نام کی جنگ چھیڑے ہوئے ہیں، ان کا مقصد جنگ لڑنا یا اشتراکیت کی روک تھام کرنا نہیں بلکہ فوجی سامان کو ٹھکانے لگانا ہے تاکہ اسلحہ سازی کے کارخانے چلتے رہیں، ویت نامی عوام یا خود امریکی عوام جن کے ٹیکسوں پہ مصارف پورے کئے جا رہے ہیں ان سے کسی کو کوئی ہمدردی نہیں۔ بوش کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں، لکھتا ہے:

> "امریکہ کے اسلحہ سازوں کو اس سے غرض نہیں کہ ان کا تیار کیا ہوا اسلحہ کس کام آتا ہے، ان کا مقصد تو صرف اسلحہ سازی سے نفع اندوزی ہے۔"

برٹرینڈ رسل نے مذکورہ بالا اقتباس میں دی ہوئی عبارت کے بعد ایک اور پیرا لکھا ہے جس سے یہ حقیقت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ امریکی سرمایہ داروں کا مقصد صرف دولت کا ضیاع اور اسراف ہے اور اس ضیاع اور اسراف سے انکی نفع اندوزی کی پیاس بجھتی ہے۔ رسل لکھتا ہے:

پچھلے چودہ برس میں امریکہ نے فالتو زرعی پیداوار خریدنے پر چار ارب ڈالر صرف

کئے لاکھوں ٹن گندم، باجرہ، مکی، مکھن اور پنیر ذخیرہ کر کے ان میں زہر ملا دیا گیا تاکہ دنیا کے بازاروں میں قیمتیں زیادہ رکھی جا سکیں، مکھن اور پنیر کے بڑے بڑے پہاڑوں میں نیلا تھوتھا ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ ناقابل استعمال ہو جائے۔ سنہ ۱۹۶۰ء تک ساڑھے بارہ کروڑ ٹن غلہ امریکہ میں ذخیرہ کیا گیا کہ سڑ جائے یہ غلہ ہندوستان کی پوری آبادی کیلئے ایک سال کیلئے کافی ہو سکتا تھا۔ (کتاب مذکور ص ۱۱۶)

اب آپ غور فرمائیں کہ آدم کی اولاد خدا کے معاشی قانون جس میں "بنی آدم اعضائے یکدیگراند" کے سنہری اصول پر عمل کیا جاتا ہے سے انحراف کر کے کیسی کیسی لغو اور بیہودہ حرکات کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ امریکہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اسکی مثال پیش کی ہے ورنہ ایک محلہ سے لیکر پوری دنیا تک کے شب و روز میں اسراف کی بدترین مثالیں موجود ہیں۔ نیز ملاحظہ فرمائیں کہ:

دولت کا یہ اسراف اور پھر خدا پر طعن کہ اس نے انسانی آبادی کو حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے اس لئے ضبط تولید کا اہتمام ضروری ہے۔

ع تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

حضرت تھانویؒ ایک مرتبہ تھانہ بھون سے کہیں باہر جا رہے تھے ایک طالب علم اپنا ٹکٹ نہیں خرید سکا حضرت کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ گارڈ کو کہہ کر ٹکٹ بنوالو، وہ طالب علم گارڈ کے پاس گیا تو گارڈ نے یہ کہا کہ تم طالب علم ہو تم سفر کرو میں تمہیں نہیں پوچھوں گا، اس پر حضرت تھانویؒ نے فرما کہ یہ تو اس کے قبضے میں نہیں۔ اس کے معاف کرنے سے تو معاف نہیں ہو سکتا اس لئے ٹکٹ دیدو۔ چنانچہ گارڈ نے اسکو ٹکٹ بنا دیا حضرت نے اتنے پیسے کا ٹکٹ زائد لیکر ضائع کر دیا جو سفر وہ کر آیا تھا، اس واقعہ کو چند ہندو دیکھ رہے تھے، انہوں نے اپنے دل کی بات کہی کہ جب اس طالب علم نے آکر پہلے یہ کہا کہ گارڈ نے مجھے کرایہ معاف کر دیا ہے تو ہم دل میں بہت خوش ہوئے کہ اس نے غریب پروری کی ہے، ایک غریب کی رعایت کی ہے، لیکن جب آپ نے فرمایا کہ یہ مالک نہیں ہے اسکو اجازت نہیں ہے کہ دوسرے کے مال میں رعایت کر سکے تو ہمیں اپنے دل کا روگ معلوم ہوا کہ ہماری نیت خراب تھی۔

مرتبہ

مولانا عبدالغفور عباسی مدنیؒ کے

مولانا عبدالرشید صاحب ابن خواجہ محمد نور بخش

پھلن شریف، خلیفۂ مجاز حضرت صاحبِ ملفوظات

ملفوظات

مرشدِ کامل | فرمایا: مرشدِ کامل وہ ہے جو شریعت پر لگائے۔ ہمارے جوہرِ ایمان کو شیطان لوٹ رہا ہے، لیکن ہمیں اس کا خیال نہیں۔

حصن حصین میں روایت ہے الشیطٰنُ جاثمٌ علیٰ قلب ابن آدم اذا ذکر اللہ خنس واذا غفل وسوس۔ شیطان اپنی چونچ ابن آدم کے قلب پر لگائے ہوئے ہے۔ جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو دور ہو جاتا ہے۔ جب غافل ہوتا ہے تو دل میں وساوس ڈالتا ہے۔

ذکرِ الٰہی سے قلب کا تصفیہ ہوگا، اس سے شوق و ذوق پیدا ہوگا، خود بخود منہیات سے بچے گا، اور ماموراتِ شرعیہ پر عامل ہوگا

حیاتِ مستعار کی قدر کرو۔ | فرمایا: یہ دنیا فانی ہے، حیاتِ مستعار ہے، چند لحظات ہے، اسکی قدر کرو —— ایک حقوق اللہ فی الاوقات ہیں جیسے صلوٰۃ جو مقررہ وقت پر پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جاتی ہے، اور صوم اور زکوٰۃ اور حج یہ سب عبادات اپنے اپنے اوقات پر ادا ہوں گی —— دوسرا حق الوقت ہے، وقت کا حق ہوتا ہے۔ یہ اگر گزر گیا تو پھر اس کا عود آنا ناممکن ہے۔

ہمارے حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

نماز را بحقیقت قضا بود نکن   نماز صحبتِ یار را قضا نخواہد بود

صالحین کی صحبت میں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اگر وقت گزر گیا یہ شکر کے لائق ہے، اور اگر (خدانخواستہ) وقت معصیت میں گزر گیا تو اس کا حق یہ ہے کہ توبہ کرو۔ وقت کی قدر کرو، گزرا ہوا وقت پھر ہاتھ نہ آئے گا، توبہ کرلو —— الوقت سیف امان تقطع او یقطعک۔ یعنی یہ وقت

تلوار کی مانند ہے یا وہ تجھے کاٹے گا یا تو اس کو کاٹے گا۔

اس وقت کو غنیمت سمجھو، تمام گناہوں سے پختہ توبہ کرو، صرف زبان سے نہ ہو بلکہ تمام اعضاء کو شریعت کا پابند کرنا ہے، آج ہم زبان سے توبہ کرتے ہیں، اور چغلی بھی کرتے ہیں، جھوٹ بھی بولتے ہیں، اور حرام بھی اڑاتے ہیں، تھیٹر اور سینما بھی دیکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہمارا پیر کامل ہے، یہ کیسی توبہ ہے، پیرِ کامل سے کونسا فائدہ حاصل کیا۔

سبحہ در کف توبہ برلب دل پُراز ذوق گناہ

معصیت را خندہ می آید بر استغفارِ ما

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا فرماتی ہیں استغفار نا یحتاج الی الاستغفار و توبتنا تحتاج الی التوبہ۔ ہماری توبہ توبہ کی محتاج ہے، اور ہماری استغفار استغفار کی محتاج ہے۔ ایسی توبہ سے بھی توبہ کرنی چاہیئے۔

اصرار علی الکبیرہ کفر تک پہنچاتا ہے، آج ہم کو اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی راحتیں دی ہیں ہمیں اس داڑھی کی سنت پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے، اس متروکہ سنّت کو زندہ کرنا چاہیئے۔ یہ سنت آجکل بالکل مرچکی ہے۔ اس کے زندہ کرنے سے سو شہیدوں کا اجر ملے گا۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوات میں جاتے تھے، درختوں کے پتے کھاتے تھے، تکلیفیں اٹھاتے، تب انہیں شہادت کا درجہ ملتا تھا، اب داڑھی کی سنت کو زندہ کرنے سے گھر بیٹھے سو شہید کا اجر مل جائے گا، اس سے بڑی نعمت اور کونسی ہے۔

صحبت کا اثر اور توکل | فرمایا: کیمیاگر کی صحبت میں بیٹھو گے تو کیمیاگری کا شوق پیدا ہوگا، دنیاداروں کی صحبت میں دنیا کی محبت پیدا ہوگی، اگر صاحبِ دل، متقی دیندار کی صحبت میں بیٹھو گے تو دین، زہد اور تقویٰ کا شوق پیدا ہوگا ـــــ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔ (التوبۃ۔آیت۔۱۱۹) ترجمہ: "اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو"

سچوں کی صحبت میں بیٹھو، ان کی صحبت میں بیٹھنے سے سچے ہو گے۔ القلب یاخذ من القلب۔ دنیا کیا چیز ہے؟ دنیا وسخ ہے، میل کچیل ہے۔ انسان کو میلا کرتی ہے، اپنے رب سے غافل کرتی ہے۔ حضرت شاہ غلام علی محدث دہلویؒ کو تیس ہزار روپے پیش کئے گئے، آپ نے واپس کر دئیے، عرض کیا گیا، کہ حضرت لنگر میں داخل کرلیں فقراء کھائیں گے، آپ

نے فرمایا نہیں۔ یہ تو ان کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ میں نے ان کو توکل کا سبق سکھانا ہے، ہمارے حضرات تو توکل کا سبق سکھا گئے ہیں۔

حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو سو افراد کنبہ کے آپ کے ساتھ تھے اور مسکینی حالت تھی۔ حرم کے شیخ نے حکومت سے گینیاں مقرر کرنے کے لئے کہا۔ آپ نے فرمایا کہ روزہ دار کے اگر افطار میں صرف پانچ منٹ باقی ہوں تو کیا اس کا روزہ توڑایا جائے گا۔ میں نے سلاطین اور امراء کے مشکوک مال سے بچنے کا روزہ رکھا ہے۔

ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنیؒ نے فرمایا کہ آپ ہر جگہ توکل دکھاتے ہو، آپ تو متوکل علی اللہ ہیں، پیسوں کو بچے کے لئے چھوڑ دیں، آپ نے جواب میں فرمایا: خلّهم علی الله۔ ان کو بھی اللہ پر چھوڑ دو۔ کتنا بڑا توکل تھا، استقامت تھی، اس سے شاہ احمد سعیدؒ اور شاہ عبدالغنیؒ کے مقامات کا موازنہ ہوتا ہے۔

حضرت شاہ محمد مظہر صاحبؒ فرماتے ہیں: کہ شاہ احمد سعید صاحبؒ ایک دن مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس کی جالی مبارک کے پاس حاضر تھے، ایک شخص لمبے قد کا آیا اور ایک تھیلی گینیوں کی لا کر سامنے رکھ کر چلا گیا، حضرت محمد مظہر صاحبؒ نے دریافت کیا۔ حضرت یہ کون تھا۔ آپ نے فرمایا: یَا مَظْهَرُ الاسرار لا تظهر۔ راز کو ظاہر نہیں کیا جاتا ؎

ہر کہ کارِ او برائے حق بود　　　کار او پیوستہ با رونق بود

من کان للّٰه کان اللّٰه له جو اللہ تعالیٰ کا ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے، توکل بڑی چیز ہے۔

دنیا میں مشغول رہنا فرمایا: الدنیا حلوة خضرة۔ دیکھنے میں دنیا خوبصورت اور میٹھی معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں مضر ہے۔ یہ دنیا سانپ کیطرح ڈنگ لگاتی ہے۔

حضرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بکرا ذبح کرایا، فرمایا گوشت تقسیم کر دو۔ تقسیم کیا گیا، فرمایا: کچھ باقی ہے۔؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضرت سب تقسیم ہو گیا ہے۔ صرف ایک ران باقی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سارا گوشت باقی ہے لیکن ران باقی نہیں۔ جو اللہ کی راہ میں خرچ ہوا ہے وہ باقی ہے ــــ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ط (النحل۔ آیت ۹۶) ترجمہ "جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے اور جو اللہ کے پاس ہے کبھی ختم نہ ہو گا۔"

آج کل ہم دن رات بنگلے بنانے اور دنیا جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں، ایسا سمجھ رکھا

ہے کہ دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔

گھروں میں ریڈیو رکھے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم خبریں سنتے ہیں۔ آپ باہر جاتے ہیں تو گھر میں عورتیں گانے سنتی ہیں جن سے ان کے خیالات فاسد ہوتے ہیں۔ نماز کا خیال نہیں، ادھر مسجد میں نماز پڑھی جارہی ہو تو ہم ادھر بیٹھے خبریں سنتے رہتے ہیں ۔۔۔ تو یہ ملہی یعنی غافل کرنے والا ہے اللہ سے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ (لقمان آیت ۔ ۶) ترجمہ: اور بعض ایسے آدمی ہیں جو کھیل کی باتوں کے خریدار ہیں، تاکہ بن سمجھے اللہ کی راہ سے بھٹکائیں۔" ۔۔۔ ریڈیو پر جو گانے سنتے ہیں وہ حرام ہیں۔

حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے سنن ابوداؤد میں روایت ہے، فرماتے ہیں کنت مع ابن عمرؓ۔ کہ ایک دن حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ تھا۔ فسمع صوت المزمار۔ حضرت ابن عمرؓ نے بانسری کی آواز کو سنا۔ وَنَاى عَنِ الطَّرِيْقِ۔ آپ راستہ سے ہٹ گئے۔ فَوَضَعَ اَصْبَعَيْهِ فِىْ اُذُنَيْهِ ۔ تو اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ وَقَالَ يَا نَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا۔ اور کہا نافع کیا تو (بانسری کی) آواز اب بھی سنتا ہے، جب نافع نے کہا کہ اب کچھ نہیں سنتا تو انہوں نے اپنے کانوں سے انگلیاں نکال لیں۔ اور فرمایا: كُنْتُ مَعَ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ کہ میں حضرت رسول کریمؐ کے ساتھ تھا۔ فَسَمِعَ مِثْلَ هٰذَا ...... پس آپ نے بھی ایسی آواز سنی اور ایسا ہی کیا۔

شرک اور بدعت سے بچو | فرمایا: جس سے شرک و بدعت کی بُو بھی آتی ہو اس سے بچو، میرا کام کہنا ہے، مانو یا نہ مانو، اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا تھا: سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ۔ (البقرہ ۔ آیت ۔ ۶) ان کے لئے برابر ہے ڈرانا یا نہ ڈرانا۔ نہ کہ آپ کے لئے۔ آپ کو تو ہر حال میں اجر ملے گا۔

شیطان کی چالوں سے کسی وقت غافل نہ ہونا چاہیئے۔ | فرمایا: شیطان سے کسی حال میں غافل نہ ہونا چاہیئے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ وہ ہستی تھیں کہ شیطان نے کئی برس ان کی جوتیاں اٹھائیں، اور لوٹا بھرتا رہا، اس خیال سے کہ کبھی موقعہ پاکر شیخ کو شکست دوں گا۔ اور زلّت قدم کروں گا، لیکن وہ مستقل مزاج تھے۔ جب شیطان مایوس ہوا کوئی موقع نہ ملا تو اجازت مانگی اور کہا اے جنید آپ بڑے شیخ ہیں، آپ جیسا مجھے کوئی شیخ نظر نہیں آتا۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا اِخْسَئْ يَا لَعِيْنُ۔ (اے لعین دُور ہٹ جا) ان الفاظ سے تو مجھے دھوکا دیتا ہے۔ شیطان

نے کہا کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہے۔ فرمایا: من اول یوم ۔ میں نے تو تجھے پہلے ہی دن سے پہچان لیا تھا۔

ایک دن سلطان عالمگیر نے اپنے شیخ کی سواری کا لگام تھاما۔ ایک درویش کے دل میں خیال آیا کہ آج ہمارے شیخ خوش ہوں گے کہ عالم گیر جیسا لگام تھامے ہوئے ہیں۔ شیخ نے فوراً فرمایا درویش اپنے آپ کو سنبھالو، یہ تو ایک عالم گیر ہے اگر سو عالم گیر ہوں تو بھی فقیر کے دل میں خیال نہیں آئے گا ——— شیطان ہر موقعہ پر انسان کو دھوکہ میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیئے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی موت کا وقت قریب تھا شیطان آیا اور کہا قد نجوت یا سفیان قد نجوت۔ (آپ تحقیق نجات پاگئے یا سفیان آپ تحقیق نجات پاگئے) آپ نے فرمایا الآن لا ، الآن لا ۔ ابھی نہیں، ابھی نہیں۔

جب تک جان قالب میں ہے، شیطان سے نجات کیسے ہوسکتی ہے۔

علمائے کرام کو مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کی کوشش کرنی چاہیئے | فرمایا: آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ علماء میں تکفیر کے فتوے چل رہے ہیں۔ دیوبندی اور بریلویت پر جھگڑے فساد شروع ہوگئے ہیں۔ اس سے امت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ علماء کرام کا کام ہے کہ امت کو آپس میں ملائیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے بھی ملائیں، خانہ جنگی ختم کردیں۔ ہماری بے اتفاقی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو کتنی تکلیف پہنچتی ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو چاہتے ہیں علماء کرام لوگوں کو آپس میں ملانے کی کوشش کریں، امت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچائیں۔ فرقہ بازی میں ذاتی اغراض آجاتی ہیں، جس سے دین کو خطرہ ہے، شرک کے اقسام میں سے اغراض بھی ایک قسم کا شرک ہے۔

پہلے حضرات ائمہ رحمۃ اللہ علیہم میں بھی اختلاف تھا، لیکن ایک دوسرے کی تکفیر نہ کرتے تھے۔ ان میں تعصب نہ تھا، تعصب سے فتنے شروع ہوتے ہیں۔ دیکھیئے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ حجاج ابن یوسف کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، کسی نے اس بات پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں فتنہ سے ڈرتا ہوں، اگرچہ میں نماز کے بعد اعادہ کرتا ہوں۔ لیکن امت جو ایک جسم کی مانند ہے، ان کے اعصاب کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا نہیں چاہتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں صحابہؓ نے کہا۔ ھل لک فی امیر المعاویہ انہ یوتر بواحدۃ ۔ (امیر معاویہؓ ایک وتر پڑھتے ہیں، ان کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ قال دعہ

فانہ فقیہ وصحابی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ فرمایا ان کو چھوڑ دو ۔ وہ فقیہہ ہیں اور صحابی ہیں۔ حضرات صحابہ کرامؓ تو اتنے انصاف والے تھے۔ ذاتہ مؤمن من حیث انہ مومن کو کافر کہنا جائز نہیں۔

حضرت امام شافعیؒ جب کوفہ میں تشریف لے جاتے تو نماز میں آمین بالجہر نہ فرماتے اور فاتحہ بھی خلف امام نہ پڑھتے، فرماتے کہ مجھے صاحب قبر حضرت امام ابوحنیفہؒ سے شرم آتی ہے (کہ ان کے فتوے پر عمل نہ کروں)

میرا مطلب بات کرنے کا یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتیں لے کر فتنے نہ کھڑے کئے جائیں۔ تشدد سے کام نہ لیا جائے۔ حضرت رسول کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم اکثر دعا میں فرماتے: اللّٰھم ارزقنا حیٰوۃ الجمع وجنبنا موت التفرقۃ۔ اے اللّٰہ ہمیں اتفاق کی حیاتی نصیب فرما اور تفرقہ کی موت سے بچا۔

معلوم ہوا کہ اتفاق میں زندگی ہے، اور تفرقہ میں موت ہے، آج عالم عالم کے ساتھ اور پیر پیر کے ساتھ عداوت رکھتا ہے۔ مسلمانوں اتفاق پیدا کرو۔

زاتفاق مگس شہد میشود پیدا ۔۔۔ خدا چہ لذت شیریں در اتفاق نہاد

بزرگ کی صحبت میں رہ کر کیا سیکھا فرمایا: حضرت حاتم اصمؒ حضرت شفیق بلخیؒ کی صحبت میں تیس ۳۰ سال رہے، ایک دن حضرت شیخ رحمۃ اللّٰہ علیہ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم نے اتنی مدت میری صحبت میں گزاری ہے، بتاؤ کیا سیکھے ہو، جواب دیا آٹھ مسئلے۔ شیخؒ نے ناراض ہو کر کہا کہ تیس سال اور صرف آٹھ مسئلے، پھر فرمایا اچھا بتاؤ وہ کون سے مسئلے ہیں ـــــ (ان میں سے تین مسئلے یہ ہیں۔)

۱۔ میں نے دیکھا کہ کسی کو مال سے محبت ہے۔ کوئی تجارت کا دلدادہ ہے کسی کو شکار پیارا ہے، کوئی اولاد سے محبت کرتا ہے، پھر میں نے دیکھا کہ جب وہ مر جاتے ہیں تو سب چیزیں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ اس لئے میں نے اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ سے محبت رکھی کیونکہ یہ چیزیں قبر میں ساتھ جائیں گی۔ یہ بصیرت مجھے آپ کی جوتیاں اٹھانے کی برکت سے حاصل ہوئی۔ حضرت شیخؒ نے مبارکباد دی اور بڑے خوش ہوئے۔

۲۔ میں دیکھتا ہوں کہ کسی کو عقل پر اعتماد ہے کسی کو زمین پر بھروسہ ہے، کسی کو زراعت پر میں نے غور کیا کہ لوگ، اور یہ سب چیزیں مخلوق ہیں، تو مخلوق کا مخلوق پر کیسے اعتماد ہو سکتا ہے، تو میں نے

سب کے خالق اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا۔ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ۔ (الطلاق۔ آیت ۳)
حضرت شیخؒ نے فرمایا: مبارک ہو۔

۲۔ میں نے دیکھا کہ ایک عالم کو دوسرے عالم کے ساتھ ایک پیر کو دوسرے پیر کے ساتھ، ایک تاجر کو دوسرے تاجر کے ساتھ بغض ہوتا ہے۔ (الا ماشاء اللہ) میں سوچ کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ حسد کے باعث ہے، اور میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَھُمْ مَّعِیْشَتَھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۔ (زخرف۔ آیت ۳۲) ترجمہ: ان کی روزی تو ہم نے ان کے درمیان دنیا کی زندگی میں تقسیم کی ہے۔)
پھر اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر جو حسد کرے گویا اسکو اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر اعتراض ہے، جو اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر اعتراض کرے اس کا ایمان نہیں، میں نے حسد کرنا چھوڑ دیا۔

آپ اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی رہو۔ آپس میں اتفاق کے ساتھ رہو، ہمارے اختلاف سے غیر اقوام فائدہ حاصل کر رہی ہیں۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں، ہمیں تنگ دل نہیں ہونا چاہئیے، دل کے ظرف کو وسیع رکھنا چاہیئے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے مراقبہ میں دیکھا کہ دنیا و مافیہا کی تمام چیزیں اس قلب کے ایک گوشہ میں پڑی ہیں۔ دیکھئے قلب میں کتنی وسعت ہے۔

فرمایا: میں ہیچ چیز نہیں ہوں، میں دعوت الی اللہ دے رہا ہوں ؎

گرچہ من ناپاک ہستم دل بہ پاکاں بستہ ام
در بہارستانِ عالم رشتۂ گلدستہ ام

جناب اختر راہی۔ ایم اے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
اور
یہود مدینہ

یہود سے بنی اسرائیل کا وہ قبیلہ مراد ہے جس کا جد امجد یہودا بن یعقوب تھا۔ لیکن یہ لفظ بنی اسرائیل کے جملہ قبائل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل ایک دور میں اللہ تعالیٰ کی مقبول اور برگزیدہ قوم تھی لیکن کٹ حجتی اور مسلسل انکار و نافرمانی کی وجہ سے بارگاہ الٰہی میں غضب کی مستحق قرار پائی۔ حضرت عیسیٰؑ جیسے رحمدل نبی نے یہود کو بتا دیا کہ :

"میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی، اور اس قوم کو جو اس کے ... دیدی جائے گی"

یہود کا اصل وطن شام و فلسطین تھا اور یہیں سے اٹھ کر حجاز میں مقیم ہوئے تھے، ترک سکونت کے بارے میں مورخین کا ایک بیان یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود کو عمالقہ کے مقابلہ کیلئے حجاز بھیجا تھا، اور یہ لوگ مدینہ میں آباد ہو گئے تھے، لیکن تاریخی قرائن اس بیان کی تصدیق نہیں کرتے۔

یہود کی نقل سکونت کی بڑی وجوہ معاشی اور سیاسی تھیں۔ اولاً یہود کی آبادی میں دن بدن اضافہ سے معاش کا مسئلہ پیدا ہو گیا، اور فلسطین کا محدود رقبہ ان کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لئے ناکافی تھا۔ چنانچہ یہود نے بہتر زندگی کے حصول کی خاطر عرب و عراق کا رخ کیا۔ اور بعض یہود حجاز میں آکر مقیم ہو گئے۔ ثانیاً پہلی صدی عیسوی میں رومیوں نے فلسطین پر پے بہ پے حملے کئے حتیٰ کہ یہود کو زمام حکومت ان کے ہاتھ میں دینی پڑی۔ یہود رومیوں کے مظالم سے تنگ آکر فلسطین چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ہجرت کے لئے قریب ترین علاقے عرب کو منتخب کیا۔

جزیرۂ عرب میں یہودیت | جزیرہ عرب میں یہودیوں کے مستقل سکونت اختیار کر لینے سے

یہودیت یہاں بھی پھیلنے لگی اور اکثر مقامی باشندوں نے یہودیت قبول کر لی۔ یہودیت کے پھیلنے کی بڑی وجہ عربوں کی مرعوبیت تھی۔ یہود ایک الہامی کتاب رکھتے تھے جس سے اہل عرب محروم تھے۔ پھر عرب بدوؤں کی نسبت یہود زیادہ متمدّن اور مہذّب تھے، اس لئے عرب یہود سے نہایت مرعوب تھے۔

ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب عربوں کے بچے زندہ نہ رہتے، وہ منت مانتے تھے کہ ہمارا لڑکا زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنا دیں گے۔ ان "جدید الیہودیت" لوگوں کی وجہ سے حجاز میں یہودیت نے برگ و بار پیدا کئے۔

ہجرت نبوی کے وقت حجاز میں یہود کی آبادیاں یثرب اور خیبر میں تھیں، یثرب کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ یہ شہر یثرب بن قانیہ نے آباد کیا تھا، اس لئے اس کا نام یثرب پڑ گیا، یثرب بن قانیہ حضرت نوحؑ کی ساتویں پشت میں تھا۔ آنحضرت کی بعثت کے وقت اس کا یہی نام تھا، مگر آپ نے بدل کر "طیبہ" رکھ دیا۔ ہجرت کے بعد "مدینۃ النبی" مشہور ہوا جو کثرتِ استعمال سے مخفف ہو کر صرف "مدینہ" بن گیا۔

مدینہ کے یہودی قبائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت مدینہ کی آبادی کا اندازہ چار پانچ ہزار کیا جاتا ہے جس میں نصف آبادی یہود کی تھی، اور باقی نصف اوس خزرج کی۔ اوس اور خزرج بارہ قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور اسی طرح یہود کم و بیش بیس قبائل میں منقسم تھے۔ یہود کے قبائل میں مندرجہ ذیل زیادہ اہم تھے۔

۱۔ بنو قریظہ :۔ یہ قبیلہ اپنے وطن شام سے ترکِ سکونت کر کے وادی مہر زور کے قریب جو مدینہ کے مشرق میں واقع ہے آباد ہو گیا تھا۔ یہ وادی بعد میں ان ہی کی نسبت سے "وادی بنو قریظہ" مشہور ہو گئی۔

۲۔ بنو نضیر :۔ یہ قبیلہ بھی بنو قریظہ کے ساتھ آبائی وطن چھوڑ کر مدینے کے جنوب مشرق میں وادیٔ بطحان کے قریب آباد ہو گیا تھا۔

۳۔ بنو قینقاع :۔ اس قبیلے کے لوگ زیادہ تر صنّاع اور زراعت پیشہ تھے خصوصیّت کیساتھ آہن گری اور زرگری میں معروف تھے۔ ان کا نام "قینقاع" بھی ان ہی پیشوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "قین" عربی میں لوہار کو کہتے ہیں۔ اور "قاع" سے مراد وہ نرم زمین ہے جو کھیتی باڑی کے قابل ہوتی ہے، مدینہ کے دوسرے قبائل کی نسبت یہ قبیلہ زیادہ طاقتور اور مضبوط تھا۔

۴۔ بنو ہدل :۔ یہ قبیلہ بنو قریظہ کے ساتھ وادی مہر زور میں آباد تھا، اور ہمیشہ سیاسی معاملات میں ان ہی کی پیروی کرتا تھا۔ اس قبیلے کو "بنو ہدل" اس لئے کہا جاتا تھا کہ اس قبیلے کے لوگوں کے ہونٹ موٹے اور لٹکے ہوئے ہوتے تھے۔ عربی میں ایسے آدمی کو ہدل کہا جاتا ہے۔

۵۔ بنو زنباع :۔ یہ قبیلہ بھی بنو قریظہ ہی کی ایک شاخ تھا اور سیاسی طور پر اسی کا ہمنوا۔

ان کے علاوہ بھی یہودیوں کے کئی قبائل موجود تھے جن کا ذکر "میثاق مدینہ" میں موجود ہے۔

یہود کی علمی برتری | مدینہ کے یہودی انصار کی نسبت زیادہ قوی تھے، اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ عہد جاہلیت میں اوس اور خزرج کے درمیان جو "جنگ بعاث" ہوئی تھی اس نے انصار کو کمزور کر دیا تھا۔ پھر تعلیمی میدان میں انصار یہود سے پیچھے تھے۔

مدینہ میں "بیت المدارس" کے نام سے یہودیوں کا ایک اجتماعی ادارہ موجود تھا جہاں ان کے احبار و رہبان جمع ہو کر پیش آمدہ مسائل پر صلاح مشورہ کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی مرتبہ ان کے اس ادارے میں جانے کا اتفاق ہوا۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں مرقوم ہے کہ وہ اکثر یہودیوں کے مدارس میں جایا کرتے تھے۔ اسی میل جول کی بنا پر یہودی کہا کرتے تھے کہ ہمیں عمرؓ سے محبت ہے۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ حجاز میں تحریر کا رواج بھی یہود کے ذریعے ہوا۔ تاہم اس علمی و سیاسی شعور کے باوجود ان کی سیاسی زندگی میں وہی قبائلی نظام پایا جاتا ہے جو عربوں کے لئے مخصوص ہے، ہر قبیلے کا جدا سردار اور الگ نظام تھا اور ہر ایک قبیلہ اپنی مصلحتوں کے مطابق جنگ و صلح میں شریک ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ یہودی جاہلی اور اسلامی جنگوں میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا دکھائی دیتے ہیں۔

مدینہ میں دعوت اسلام | ہجرت سے تین سال پہلے یعنی ۱۰ھ نبوی میں مدینے کے چھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ اور مدینے جا کر اس کا اظہار کیا۔ دوسرے سال یہ تعداد دگنی ہو گئی اور بارہ آدمیوں نے آکر بیعت کی اور خواہش ظاہر کی کہ ان کے لئے ایک معلم مقرر کر دیا جائے، چنانچہ مصعب بن زبیر کو ان کا معلم بنا کر ساتھ کر دیا گیا، یوں مدینے میں گھر گھر اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

یہود کے صالح الفطرت نوجوان تورات کی بشارتوں اور احبار و رہبان کی بار بار یاد دہانیوں کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لے آئے۔ مثلاً عبداللہؓ بن سلام اور میمونؓ بن یامین وغیرہ۔ ادھر مدینے کے ہر فرد کو اسلام کی دعوت پہنچ رہی تھی اور مدینے کے جانثار صحابہؓ اپنی زندگیوں

میں ایک عالمگیر انقلاب محسوس کر رہے تھے اور اسلام کی خاطر جان کی بازی لگانے کے لئے تیار ہو رہے تھے اور ادھر مکہ میں تحریک اسلامی کو کچلنے کی کوششیں جاری تھیں۔ ظلم کی چکی چل رہی تھی اور ستم کی انتہا ہو رہی تھی، مسلمانوں کی جان کے لالے پڑ گئے تھے، چنانچہ ہجرت کا پروگرام ترتیب پایا۔ مشرکین مکہ کو معلوم ہوا تو ان کے ذہن میں آیا کہ نامعلوم یہ لوگ باہر جا کر ہم پر حملہ آور نہ ہو جائیں، چنانچہ مشرکین کے سرداروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ لیکن یہاں اور داؤ بیکار ثابت ہوئے وہاں ان کا یہ منصوبہ بھی خاک میں مل گیا۔

مدینہ پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار و مہاجرین کو باہم پیوست کرنے کی خاطر "مواخات" کا رشتہ قائم کیا اور یہود کیساتھ معاہدہ کر کے ان کی سیاسی قوت کو غلط راستے میں استعمال ہونے سے روک دیا۔ مسلمانوں اور یہود کے درمیان جو معاہدہ ہوا، کئی وجوہ سے اہم ہے۔

اولاً دنیا کا پہلا تحریری دستور جو کسی مملکت کی خاطر معرض وجود میں آیا، یہی "میثاق مدینہ" ہے۔ امریکی آئین جو موجودہ دور کا پہلا تحریری آئین ہے۔ ۱۷۸۷ء میں فلاڈلفیا کے مقام پر بنایا گیا۔ سوئٹزرلینڈ میں ۱۸۴۸ء میں پہلا تحریری دستور وجود میں آیا۔ اسی طرح تیسری جمہوریہ فرانس کا آئین ۱۸۷۵ء میں بنایا گیا تھا، غرضیکہ موجودہ ریاستوں کے معرض وجود میں آنے سے بھی پہلے ۶۲۳ء میں پہلا تحریری آئین مدینہ میں نافذ ہو گیا تھا۔

ثانیاً نظریہ معاہدۂ عمرانی (Social Contract theory) کے تحت اگر کسی دور میں کوئی ریاست وجود میں آئی تو ان میں مدینہ کی شہری مملکت کو اولیت کا مقام حاصل ہے۔ ■■

تھوڑی دیر

اہل حق

کیساتھ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک شاگرد جن کا تعلق کان پور سے تھا حج کو بحری سفر سے تشریف لے جا رہے تھے۔ اچانک سمندر میں طوفان آیا اور جہاز طوفان میں گھر گیا۔ جہاز پر سوار تمام لوگوں کو ہلاک ہونے کا یقین ہو گیا، طوفان اتنا شدید تھا کہ جہاز کا عملہ بھی پریشان ہو گیا تھا، لوگوں نے گریہ وزاری شروع کر دی، ایک کہرام سا مچ گیا۔ اسی حالت میں حضرت تھانوی کے یہ شاگرد خوش ہو رہے ہیں، جہاز کا کپتان انگریز تھا اس نے سمجھا کہ یہ اللہ کا مقبول بندہ ہے اس سے درخواست کی جائے کہ مخلوقِ خدا خصوصاً حجاج خطرے میں ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ اس طوفان سے نجات مل جائے، انہوں نے دعا فرمائی، اللہ کی قدرت سے جہاز طوفان سے نکل گیا، اس بات کو دیکھ کر پوچھا گیا کہ یہ خوشی کا کونسا مقام تھا، لوگ تو رو رہے تھے اور گریہ وزاری کر رہے تھے اور آپ اس پر خوش ہو رہے تھے، جواب میں فرمایا
"لوگ خلوص دل سے اللہ کو یاد کر رہے تھے، اس پر خوش ہو رہا تھا۔"

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کی خدمت میں ایک صاحب نے لکھا کہ حضرت معمولات گو ادا کر رہا ہوں الحمد للہ تہجد کی بھی توفیق مل رہی ہے لیکن اپنی حالت پر نظر کرتا ہوں تو بالکل کچھ بھی نہیں، جواب میں فرمایا: "وہ دن رونے کا ہوگا جس دن اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگو گے۔"

مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی ایک مرتبہ امرتسر تشریف لے گئے، ایک روز ایک صاحب نے مولانا صاحب سے کہا کہ حضرت میرے گھر تشریف لے چلیں میرے بچے ہیں ان کو دم کر آئیں، حضرت تیار ہو گئے۔ جب ان کے مکان پر پہنچے تو پتہ چلا کہ بیوی بچے تو نہیں صرف

حضرت کو برکت کے لئے بلایا ہے، تو حکم دیا کہ واپس چلو۔ راستے میں ایک صاحب نے عرض کی کہ حضرت اگر آپ تشریف لے جاتے تو ان کا جی خوش ہو جاتا۔ فرمایا کہ "جی خوش ہونے کیلئے تو نہیں بلایا تھا، برکت کے لئے بلایا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے جانے سے برکت ہوگی، اور میں بڑا برکت والا ہوں"

مولانا ولی احمد صاحب جو کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کے خاص شاگرد اور مرید تھے، حضرت کی وفات کے بعد مولانا تھانوی سے تعلق قائم کیا، حضرت مولانا محمود حسن صاحب نے ان کو حسن پور میں مدرس بنا کر بھیجا تھا، تو ساری زندگی اس کے علاوہ مدرسی نہیں کی۔ بہت بڑے بزرگوں میں سے تھے، ایک روز کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ مسجد میں صبح کی نماز کے وقت کوزے کو نلکے کے نیچے رکھ دیا، اور انتظار کرنے لگا کہ جب کوزہ بھر جائے تو پھر وضو کروں گا مسجد میں چونکہ اندھیرا تھا اس لئے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کوزے کا منہ نلکے کی ٹونٹی کی سیدھ میں ہے یا نہیں۔ جب کافی دیر گذر گئی اور لوٹا نہ بھرا تو پھر ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوزے کا رخ نلکے کی ٹونٹی کیطرف نہیں تھا، اس لئے کوزے میں پانی نہ بھر سکا۔ صبح کی نماز کے بعد اسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے درس میں فرمایا کہ اس واقعہ سے ایک بات واضح ہوگئی کہ "اللہ کی رحمت کا پانی انسان کے دل کے کوزے میں آتا رہتا ہے، اگر دل کے کوزے کا رخ اللہ کی رحمت کی ٹونٹی کی سیدھ میں ہو، لیکن اگر دل کے کوزے کا رخ اللہ کی رحمت کی ٹونٹی کی طرف نہ ہو تو پھر کام نہیں بنتا"

ایک صاحب حضرت تھانویؒ سے تعویذ مانگنے آئے، انہوں نے کہا کہ فلاں مرض کیلئے تعویذ دے دیں۔ حضرت نے فرمایا بھائی میں تعویذ کا کام نہیں جانتا، اگر آرام نہ آئے تو پھر تو نہیں آؤ گے۔ اس نے جواب دیا کہ اس مریض کے لئے نہیں آؤں گا، حضرت نے فرمایا کیسی سمجھ کی بات کی ہے، پھر اسکو فرمایا کہ تجھے تو فقہ پڑھنا چاہئے تھا۔ لوگوں نے کہا حضرت یہ تو چمار ہے، فرمایا میں نے کونسا برا مشورہ دیا ہے۔

حضرت تھانویؒ کے ایک خادم بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ بیمار ہوا اور بیماری نے طول پکڑا، میں زندگی سے مایوس ہو کر دیوار کی طرف منہ کر کے آنے والے حالات کو سوچ سوچ کر رو رہا تھا کہ عمل کچھ ساتھ نہیں اگر ایسی حالت میں موت آگئی تو کیا بنے گا۔ والدہ صاحبہؒ نے جب دیکھا تو فرمایا کہ کیوں رو رہا ہے، میں نے عرض کیا کہ اپنی حالت کو میں دیکھتا ہوں اور مرنے کے بعد جو حالات پیش آنے والے ہیں اور جب اس پر نظر کرتا ہوں کہ اپنے پلے بھی کچھ نہیں اگر ایسی حالت میں موت آگئی تو کیا بنے گا، اس انجام پہ رونا آگیا۔ اس پہ والدہ صاحبہ نے فرمایا "مرنے کے بعد بھی وہی رب ہوگا

جواب ہے، یہاں تمام کوتاہیوں کو دیکھ کر کوئی وظیفہ بند نہیں کیا مرنے کے بعد تو اس سے زیادہ رحمت فرماویں گے۔" اس سے الحمدللہ میری پوری تسلی ہوگئی۔

مولانا ولی احمد صاحب شاگرد حضرت شیخ الہند کو شام کے وقت سیر کرانے کے لئے ایک روز سے جایا گیا تو سڑک پر موٹروں اور دوسری سواریوں کی بھاگ دوڑ دیکھ کر فرمایا: جیسا شام ہونے سے پہلے دن کا کام لوگ جلدی جلدی ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان لوگوں کی دوڑ دھوپ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی شام ہونے والی ہے۔

مولانا ولی احمد صاحب نے ایک روز فرمایا: "جب میں ایک دفعہ کلمہ پڑھتا ہوں، مثلاً سبحان اللہ تو اندر سے آواز آتی ہے، ولی احمد ٹھیک ہے آگے پڑھو۔ پھر میں آگے پڑھتا ہوں۔ پھر جب میں مسجد میں عبادت کرنے کے بعد گھر جانا چاہتا ہوں تو درخواست کرتا ہوں کہ "یا اللہ اب بھوک لگ گئی ہے اس لئے گھر جانا چاہتا ہوں تو آواز آتی ہے کہ "ہاں ضرور جاؤ اور خوب آرام کرو"۔ اس کے بعد فرمایا "اس آواز کو میرا دل سنتا ہے۔"

ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی دعوت کی برسات کا موسم تھا۔ آپ نے اسکی دعوت قبول کر لی اور کہا کہ مغرب کے بعد آ جاؤں گا۔ اس آدمی کا گھر شہر سے دور تھا، اتفاق سے زور کا مینہ برسا اور دارالعلوم سے لیکر اس آدمی کے گھر تک پانی ہی پانی ہوگیا۔ بہرحال آپ پانی میں سے گذرتے ہوئے اس آدمی کے گھر تک پہنچے، آواز دی وہ آدمی گھبرایا ہوا باہر نکلا اور عرض کی کہ بارش کی وجہ سے کچھ انتظام نہ کر سکا، چنانچہ آپ نے فرمایا کیا مضائقہ ہے جو گھر میں موجود ہے۔ وہ شخص اندر گیا اور کھانے کا بندوبست کیا۔ اسکی عورت ایسی گھبرائی ہوئی تھی کہ اس نے ساگ کی بجائے ایلوا جو کہ جانوروں کیلئے تیار کیا گیا تھا، اندھیرے میں اپنے خاوند کو دے دیا، صبح کو جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ساگ کی بجائے ایلوا مولانا کو دیدیا گیا۔ وہ شخص مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور معافی مانگنے لگا، فرمایا: "کوئی بات نہیں ایسا بھی ہوتا ہے۔"

FOUNTAIN
BRAND
فوارہ مارکہ
D. M. TEXTILE MILLS LTD
فوّارہ مارکہ
اعلیٰ قسم کا
سُوتی دھاگہ
سنگل اور فولڈڈ
۱۰ کاؤنٹ سے ۴۰ کاؤنٹ تک
ہینکس کے علاوہ کونز پر بھی دستیاب ہے
تیار کنندگان:
ڈی-ایم-ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
رجسٹرڈ آفس: ۱۱۶- کاٹن ایکسچینج بلڈنگ — پوسٹ بکس نمبر ۴۶۱۷ — کراچی
تار کا پتہ: DOSTCOT — فون — ۲۲۱۳۳۰ — ۲۲۳۹۱۳
ملز. سٹی چھاؤنی — پوسٹ بکس ۵۴ — راولپنڈی
تار کا پتہ: FINETEX — فون ۶۲۷۵۵ — ۶۶۹۳۲ — ۶۲۷۵۵
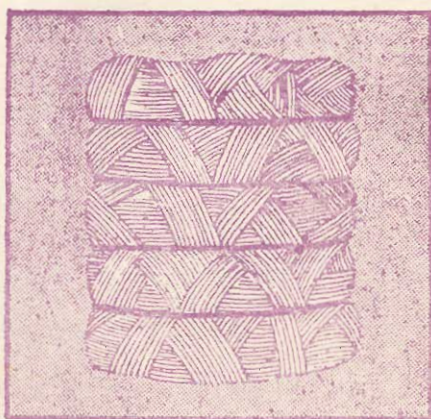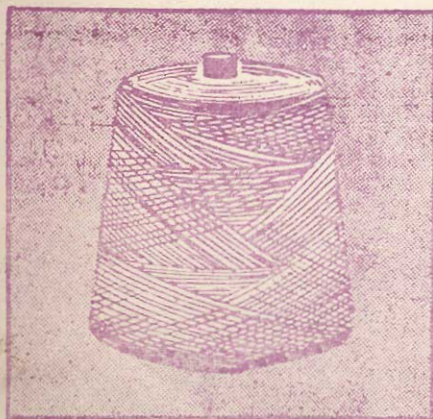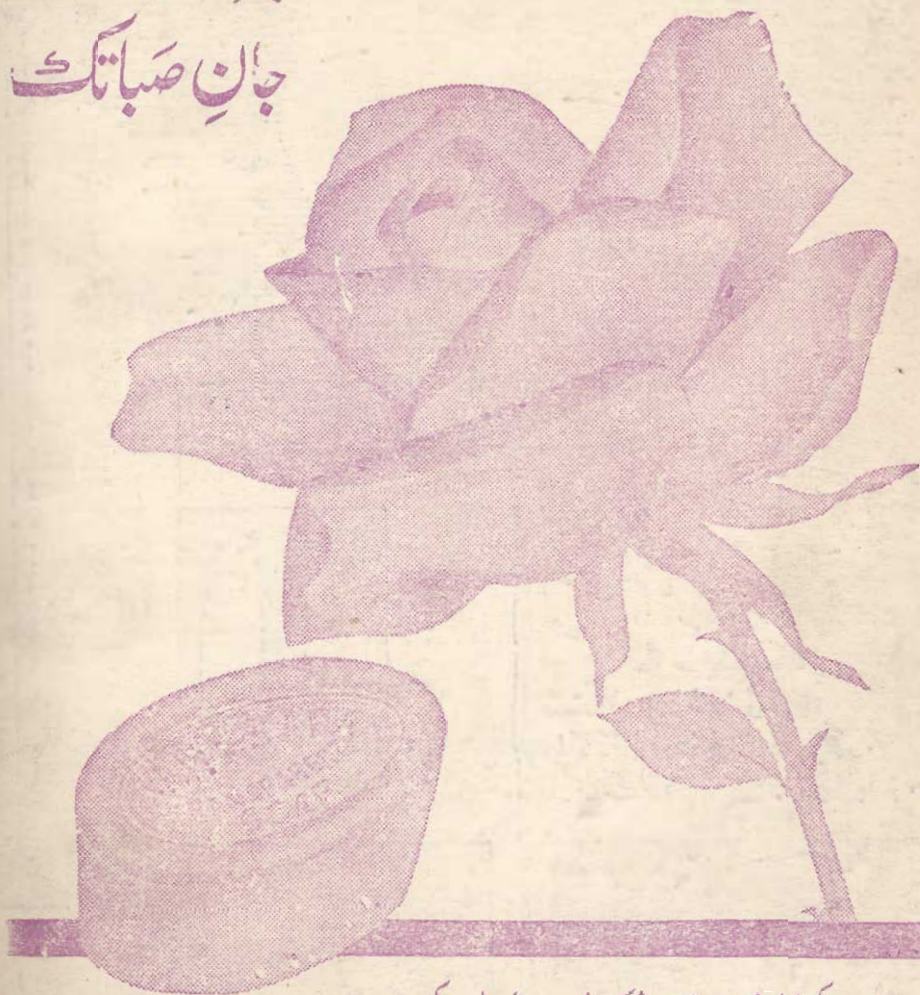
بادِ صبا سے
جانِ صبا تک
بادِ صبا کے لطیف جھونکے، معصوم پھولوں کی
شگفتگی کا پیغام دیتے ہیں اور جانِ صبا کا
معطر جھاگ حُسن کو نئی تازگی اور دلکشی بخشتا ہے۔
جانِ صبا ٹرانسپیرنٹ حُسن افروز صابن
جمیل سوپ ورکس لمیٹڈ۔ کراچی۔ ڈھاکہ